# امام جعفر صادق علیہ السلام

## اور

# مذاہب اربعہ

مؤلف

استاد اسد حیدر

ترجمہ

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی

ناشر

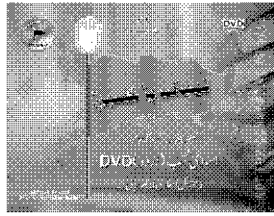
اکبر حسین جیوانی ٹرسٹ کراچی

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔



سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان







۷۸۶

۹۲-۱۱۰

یا صاحب الزماں ادرکنیؑ

DvD Version

# لبیک یا حُسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

## اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔





SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

نام کتاب ________ امام جعفر صادق علیہ السلام اور مذاہب اربعہ
مؤلف ________ استاد اسد حیدر
مترجم ________ علامہ السید ذیشان حیدر جوادی
ٹائٹل ________ مجاہد حسین حر، قائم گرافکس، جامعہ علمیہ ڈیفنس کراچی
ناشر ________ اکبر حسین جیوانی ٹرسٹ کراچی

ملنے کا پتا

# فہرست

## ابوحنیفہ ---------- ۳۱۵



## امام جعفر صادقؑ۔ آپ کا دور اور اس کے مشکلات ---------- ۳۴۳



## امام صادقؑ کا مدرسۂ فکر اور اس کی تعلیمات ---------- ۳۶۵



بسمہٖ سبحانہٗ

# عرضِ ناشر

بیسویں صدی کے نصف اوّل تک سوانح نگاری کا عام تصور یہ تھا کہ انسانی زندگی کے جملہ واقعات کو اوّل سے آخر تک نقل کر دیا جائے اور اس سے استنتاج کا کام قاری کے ذوق کے حوالہ کر دیا جائے جس کا نتیجہ عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ ہر شخص ان واقعات کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لیتا تھا اور مختلف رسوم و عادات اور مختلف خیالات و مفروضات کے لئے منتشر واقعات کو دلیل بنا لیا جاتا تھا۔

صلح پسند انسان حدیبیہ کے واقعہ کو حوالہ میں پیش کرتا تھا اور جنگجو مزاج رکھنے والا بے سروسامانی کے باوجود بدر کے معرکہ کو اپنے لئے نمونۂ عمل قرار دیتا تھا۔

لیکن اس صدی کے نصف دوم میں یہ ذوق تقریباً ختم ہو گیا اور اہلِ قلم نے واقعات نگاری پر تجزیہ نگاری کو مقدم کرنا شروع کر دیا اور ہر معصوم سے متعلق ایسی کتابیں منظرِ عام پر آنے لگیں جن کا تعلق واقعات نگاری سے زیادہ تجزیہ و تحلیل سے تھا اور اس سلسلہ کا ایک بڑا بیش قیمت ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ معصومینؑ میں ہر فرد کے بے مثل و بے نظیر اور حجت و سند ہونے کے باوجود امام جعفر صادقؑ کی زندگی کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا کہ آپ کا دور دو عظیم طاقتوں کے فیصلہ کن ٹکراؤ کا زمانہ تھا اور اس طرح اس دور کا سیاسی تجزیہ بیحد ضروری تھا اور پھر اسی دور میں ائمہ مذاہب اور مذاہب کی پیداوار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لہذا مذہبی اعتبار سے بھی اس دور کا جائزہ لینا اور اس ماحول میں اسلامی عمل کا مطالعہ کرنا بیحد ضروری تھا۔

چنانچہ مختلف مصنفین اور مؤلفین کرام نے آپ کے دور کو مرکز توجہ قرار دیا اور اس پر چھوٹی بڑی کتابیں بھی تالیف کیں لیکن اس سلسلہ کی سب سے زیادہ گرانقدر خدمت جو اس صدی کی یادگار اور شاہکار بن گئی ___ جناب استاد اسد حیدر کی کتاب "الامام الصادق والمذاہب الاربعہ" تھی جس میں امام کی ذاتی زندگی، آپ کے اوصاف و کمالات اور کرامات و تعلیمات کے ساتھ آپ کے دور کے جملہ سیاسی حالات کا مکمل جائزہ لیا گیا تھا ___ اور پھر اس کے بعد ان اسباب و عوامل سے بھی بحث کی گئی تھی جن کی بنا پر دیگر مذاہب فقہ منظرِ عام پر آئے اور جن کی بنیاد پر ان مذاہب کے پیشواؤں اور رہنماؤں نے کامیابی حاصل کی۔

آپ کی کتاب نے منظرِ عام پر آتے ہی علمی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی اور ہر طرف اس کے مضامین کی معنویت اور اسلوب بیان کی متانت کا چرچا ہونے لگا ___ اساتذۂ فن نے داد بیان دی ___ علماء و مفکرین نے اندازِ استدلال کو سراہا اور

مفتیانِ ممالک اسلامیہ استنتاج و استنباط کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔

مگر اردو زبان اس ذخیرہ سے محروم تھی۔ خدا غریقِ رحمت کرے مدیر اصلاح مولانا محمد باقر نقوی طاب ثراہ کو ـــــ کہ انھوں نے ائمہ اربعہ کے حالات کو بطور خلاصہ بیان کر دیا ـــــ لیکن قوم اصل کتاب کی معنویت کا احساس نہ کر سکی۔ جس کی بنا پر مکتبہ تعمیر ادب لاہور کے ذمہ دار حضرات نے صدر ادارۂ تنظیم المکاتب علامہ جوادی دام ظلہ سے فرمائش کی اور آپ نے اس کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا۔ دو جلدیں شائع ہوئیں اور کام نامکمل رہ گیا۔ حالات بدل گئے اور محرومی برقرار رہی۔

ہمارا ملک ہندوستان ان دونوں کتابوں سے بھی تقریباً محروم ہی رہا جس کی بنا پر ادارۂ تنظیم المکاتب نے فیصلہ کیا کہ کم سے کم انھیں دونوں جلدوں کو شائع کر کے مومنین کرام کو ان کے مضامین اور اندازِ بیان سے روشناس کرا دیا جائے۔

ـــــ مکمل کتاب سے استفادہ تو مکمل کتاب کے ترجمہ کا متقاضی تھا اور سردست اس کے حالات نہیں تھے اور دو جلدوں کے جملہ مضامین کی اشاعت بھی اصل مقصد کے لئے کافی نہ تھی لہٰذا خود علامہ جوادی دام ظلہ نے فیصلہ فرمایا کہ جلد اول کے ساتھ جلد دوم کا وہ حصہ جو حضرت ابو حنیفہ کے حالات سے متعلق ہے اسے شامل کر دیا جائے اور باقی تین ائمہ مذاہب کے حالات کو سردست نظر انداز کر دیا جائے کہ ان کے ماننے والے ہمارے ملک اور اس کے اطراف میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مطالب کی تنظیم اور کتابت کا مرحلہ تقریباً ایک سال پہلے سر ہو گیا تھا لیکن اشاعت کا مسئلہ بھی دوسرے مسائل سے کم اہمیت کا مالک نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی دوڑ دھوپ ہوتی رہی۔

خدا سلامت رکھے "ادارۂ نشرِ افکارِ جوادی" کے سب سے سرگرم کارکن ڈاکٹر اسد صادق (نیوجرسی) کو کہ انھوں نے بروقت اس مشکل کا علاج فرما دیا اور اب کتاب آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے۔

ترتیب، تنظیم، اشاعت کا کام ہمارا تھا جو ہم نے انجام دے دیا ـــــ خریداری، قرأت، دلچسپی اور استنتاج آپ حضرات کا کام ہے ـــــ دیکھیں آپ کہاں تک اپنے فرض کو ادا کرتے ہیں اور دیگر عظیم کتابوں کی اشاعت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

ربِ کریم آپ سب کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ کو جنت الفردوس میں بلند ترین درجات عنایت فرمائے جن کے ایصالِ ثواب کے لئے کتاب کی اشاعت میں تعاون کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ زیرِ نظر کتاب اصل کتاب کی دو جلدوں کا خلاصہ ہے جس میں ایک جلد مکمل ہے اور دوسری جلد کا صرف ایک حصہ اخذ کیا گیا ہے ـــــ جس کی بنا پر پہلی جلد کے شائع ہونے کے بعد سامنے آنے والے تاثرات کو بھی کتاب کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے اور مترجم محترم کے انتہائی مفید مقدمہ کو بھی شریک کر دیا گیا ہے۔

ادارہ حسبِ سابق اپنے اس کارنامہ پر بھی سرفراز و سربلند ہے اور مالکِ کائنات سے ملتمس ہے کہ بطفیل معصومین علیہم السلام خدمتِ دینِ مبین کی توفیقات سے سرفراز فرماتا رہے۔

والسلام

سید صفی حیدر

سکریٹری تنظیم المکاتب لکھنؤ



# تاثرات

## کتاب "امام صادقؑ اور مذاہب اربعہ" پر ایک نظر

ڈاکٹر حامد حفنی داؤد پروفیسر ادبیات قاہرہ

"یہ تاثرات استاد اسد حیدر کی مذکورہ بالا کتاب کو دیکھ کر ڈاکٹر حامد حفنی داؤد نے ظاہر فرمائے ہیں جو بظاہر ایک خط کی شکل میں ہیں لیکن کتاب اور اس کے موضوع پر ایک جامع تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

— جوادی

تقریباً ۲۰ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے میں اسلامی تشریع اور دینی علوم کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا۔ دفعتاً میری توجہ حضرت امام جعفر صادقؑ، اُن کی جاذبِ نظر شخصیت، علمی فکر اور روحانی عظمت کی طرف کھنچ گئی۔ میں نے اس موضوع پر ایک اسّی صفحہ کا مقالہ لکھ دیا اور اس میں آنحضرتؑ کی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر کر دیئے۔ لیکن اس کے بعد جب اس مقالہ کو اپنے عدیم المثال استاد مرحوم عبدالوہاب عزام کے سامنے پیش کیا تو موصوف کے چہرہ پر صرف ایک تبسم کی لہر دیکھی اور بس! میں نے اسی تبسم سے اندازہ کر لیا کہ موصوف میری اس جدوجہد سے بے حد مسرور ہیں اور اس مسرت کا راز صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس عظیم المرتبت شخصیت کو بھی اپنی فرقہ واریت کا شکار بنا دیا ہے اور اب یہ امام شیعوں کے لئے زیادہ قابلِ ارادت ہو گئے ہیں۔

ماحول کا یہ جبر اور تعصب کی یہ تنگ نظری میرے دل میں ایک مدت تک کھٹکتی رہی اور میں نے آخر میں یہ فیصلہ کر لیا کہ "جعفر صادقؑ ربانی علماء کے امام اور مجددین مذہب کے پیشرو" کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کروں، لیکن افسوس کہ ماحول اور معاشرہ نے میرے اس پاکیزہ ارادہ کی ذرہ برابر تائید نہ کی اور حالات میرے ارادہ کو پیچھے کی طرف ہی ڈھکیلتے رہے، پھر اس موضوع پر چند مضامین بھی نظر سے گذر گئے جن سے ارادہ اور سست پڑ گیا۔

لیکن اسے کیا کیجئے کہ حضرت احدیت حق کو حق ثابت کرنا ہی چاہتا تھا۔ اس کا منشا تھا کہ حقانیت کی قوت زمان و مکان کے حدود سے مافوق رہے اور اس طرح ۲۰ سال کی طویل مدت کے بعد بھی مقدر نے وہ وقت دکھلا دیا جب حق اپنے مرکز پر قائم ہو اور باطل کے بادل چھٹتے ہوئے نظر آئیں، حق کا چہرۂ روشن سامنے آئے اور جہالت کی تاریکیاں کافور ہو جائیں۔ اس عظیم جہاد اور مبارک فتح کا سہرا استاد اسد حیدر کے سر ہے جنھوں نے "امام صادقؑ اور مذاہب اربعہ" کو تالیف کر کے اعلان کر دیا کہ امام صادقؑ کی سیرت پر مغالطات کے پردے نہیں ڈالے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب مذہب جعفری اور دیگر مذاہب کے درمیانی رابطہ کا بھی اظہار کرتی ہے جس سے اکثر علماء اسلام ناواقف ہیں۔

اس کتاب میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ کتاب امام صادقؑ کے سلسلے میں نہایت جامع اور آپ کی سیرت پاک کے اکثر پہلوؤں پر حاوی ہے۔ مؤلف نے آپ کے بارے میں ہر صاحب رائے کی رائے کو جمع کر کے ان تمام واقعات سے بھی بحث کی ہے جنھیں حضرت کی زندگی سے دور یا نزدیک کا کوئی تعلق ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس بحث میں منطقیت غالب ہے اور مذہبی تعصب ناپید۔ اندازِ تحریر صاف بتاتا ہے کہ مؤلف ایک طالب حق کی طرح میدان میں آئے ہیں اور کلمۂ حق کی کسی توہین کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ ابتدائے کتاب میں اسلامی خلافت سے متعلق ایسی واضح اور مستحکم بحث کی گئی ہے جسے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا یہ واقعات مؤلف کے چشم دید ہیں۔ تاریخ اسلام کے اس اندازِ تالیف کو اربابِ نقد و نظر کی طرف سے صحیح مرتبہ ملنا چاہئے اور بعد کے مؤلفین کو اسے مشعلِ راہ بنانا چاہئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمیں تاریخ اسلام کا علمی تجزیہ کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ سیاست اور فقہ کے مذاہب کا امتیاز واضح ہو سکے اور حق کے پرستار کو صائب الرائے اور

باطل کے پیرو کو کھلا گمراہ کہا جا سکے۔ اس ضرورت کا سب سے اہم منشا تاریخ کے ساتھ اموی اور عباسی سیاستوں کا خطرناک کھیل ہے جس میں آٹھ سو سال تک شیعوں کی پامالی کی المناک داستان بھی پوشیدہ ہے۔ میری نظر میں اسلامی ثقافت کی تحلیل میں علمائِ شیعہ کا یہ جہاد اموی اور عباسی دور کے مظالم کا ایک ردِّ عمل ہے جس نے شیعیانِ علیؑ کو ان سیاستوں کے رخ سے نقاب اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے اور یہ جذبہ ان کے دلوں میں اس قدر راسخ کر دیا ہے کہ آج بھی اہلِ ایمان کے دلوں میں یہ نفسیاتی ردِّ عمل وراثت کے طور پر محفوظ ہے اور ان کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے اور یہی سبب ہے کہ شیعہ تقلیدی یا زبانی قسم کے مومن نہیں ہیں بلکہ ان کے ایمان میں وراثتی تڑپ ہے۔ ان کے مسلک میں عقائدی زندگی ہے اور انھیں اسباب کی بنا پر ان کا جہاد صدیوں سے مستمر ہے اور اپنے اندر ایک جہدِ مسلسل لئے ہوئے ہیں۔

مؤلف نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں تاریخ اسلام کے ان ادوار کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مذاہب کی تعمیر میں حصّہ لیا ہے اور جن سے امام صادقؑ اور ان کے مذہب کو ٹکرانا پڑا ہے۔ اس کے بعد مذاہب کا باہمی تقابل اور ہر ایک کے رواج و بقا کے اسباب کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ یہ وہ تحقیقات ہیں جن پر حق و انصاف کے ساتھ تبصرہ کرنے کے لئے ایک پوری جلد درکار ہے لیکن ہم اپنے جذبات کے اظہار پر مجبور اور اتنی تفصیل سے عاجز ہو کر صرف چند اشاروں پر اکتفا کئے لیتے ہیں۔

اس کتاب میں سب سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ بحث خلافت کے بارے میں ہے جس کے مستحکم اصولوں کے سلسلے میں میں مؤلف سے اتفاق کرتا ہوں کہ اسلامی مشکلات کا آغاز دورِ عثمان ہی سے ہوا ہے جب کہ تختِ حکومت پر بنو امیہ کے قدم آئے ہیں اور انھوں نے اسلامی ممالک میں اسلامی مقدرات سے کھیلنا شروع کیا ہے لیکن اے کاش! مؤلف نے اور پہلے سے یہ بحث اٹھائی ہوتی اور اس کا سلسلہ وفات سرورِ کائنات تک پہنچا دیا ہوتا۔

مؤلف نے امام علیؑ کی تاریخ سے بھی کافی انصاف کیا ہے، جہاں ام المومنین کے خروج، معاویہ کی سازشیں اور طلحہ و زبیر کی اس بیعت سے بحث کی ہے جسے اپنی خواہشات کی تکمیل کا وسیلہ بنایا گیا تھا۔ پھر خونِ عثمان کے مطالبہ کے ہنگامہ کا ذکر کیا ہے جس سے علیؑ کا دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ حقیقتاً تاریخ اسلام کا یہ وہ مشکل دور تھا جہاں عرب اور مستشرقین دونوں قسم کے محققین کے پائے نگاہ

میں لغزش آگئی ہے اور حضرت علیؑ کو زاہد و متقی ثابت کرنے والوں نے ان کو سیاست سے ناواقف بنا دیا ہے۔ انھیں یہ خبر بھی نہ ہو سکی کہ "اسلام میں سیاست و زہد کے حسین امتزاج ہی کا نام سیرت علیؑ ہے۔" کاش ہمارے مؤلف نے سیرتِ علیؑ کے اہم جزء "تکامل نفسی" سے بھی بحث کی ہوتی اور اس طرح مستشرقین کی جہالت کو بے نقاب کر دیا ہوتا اس لئے کہ معاویہ کی سیاست اور اس کا حضرت علیؑ پر حملہ نو مسلم افراد کے ان دلی جذبات کا مظاہرہ تھا جو انھوں نے حضرت علیؑ کے مجاہدات کے وقت سے اپنے دلوں میں چھپا رکھے تھے۔

میں تاریخ مذاہب کے اس قابلِ قدر "دائرۃ المعارف" پر زیادہ طولانی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا لیکن امام بخاری کے بارے میں مؤلف کی رائے پر ایک نظر ضرور کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ انھوں نے کتاب بخاری پر دو پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ ایک میں علمی اعتبار سے روایات کی سند پر تبصرہ کیا ہے جس سے مجھے سو فیصدی اتفاق ہے اس لئے کہ امام بخاری کی زندگی میں صرف وہی روایتیں مرتب ہو سکی تھیں جن کا وجود عبداللہ بن عمرو عاص کے صحیفہ میں تھا۔ اس کے علاوہ باقی روایتیں زیرِ نظر نہ آسکی تھیں اس لئے ان پر صحیح تنقید ہونی چاہئے اور ان میں صحیح وضعیف کا امتیاز ہونا چاہئے۔ دوسرا پہلو صرف اجتہادی ہے جس کا تعلق امام بخاری کے احادیثِ معصومینؑ سے اعراض سے ہے۔ اس سلسلے میں میری رائے مؤلف سے مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کا محرک امام بخاری کا معصومینؑ کو غیر معتبر سمجھنا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کا باعث عباسی حکام کا وہ جبر و استبداد تھا جس میں زبان کھولنے کے لئے بہت بڑی جرأت کی ضرورت تھی۔ اور معصومینؑ سے روایت کرنے کے لئے زندہ درگور ہونے کے لئے تیار رہنا ضروری تھا اور امام بخاری میں یہ جرأت نہ تھی۔

یہ صحیح ہے کہ امام بخاری کی ادبی شجاعت نے ٹھوکر کھائی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی ساری جدوجہد کو بے اعتبار ٹھہرا دیا جائے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے ان کی "خطائے اجتہادی" تصور کر لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ انھوں نے حکام وقت کے خوف کی بنا پر احتیاط کی اور وہ کچھ نہ لکھ سکے جو ان کے دل میں تھا۔ اور اگر آپ اس خوف کو تسلیم نہیں کرتے تو اتنا مان لینے میں کیا قباحت ہے کہ امام بخاری تک ائمۂ معصومینؑ کی روایتیں نہیں پہنچ سکیں اس لئے

کہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حکّامِ جور نے ائمت اور اہلبیتؑ کے درمیان ایک ایسے گھرے پردے حائل کر دیئے تھے کہ ان کے علم کی شعاعیں طلاب حقیقت تک پہنچنا انتہائی مشکل تھیں۔

بہر حال امام بخاری کا ان روایات کو ترک کر دینا نہ روایات کی عظمت و منزلت کو گھٹا سکتا ہے اور نہ خود ان کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔

پروردگار عالم سے ہماری التجا ہے کہ ہمیں اس عظیم کتاب سے استفادہ کے مواقع بہم پہنچائے اور مؤلف کو ان کے ارادہ کی توفیق کرامت فرمائے۔ ہم اس لمحہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر حامد حفنی داؤد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# دعوتِ قرآنی

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم

ایمان والو اللہ سے مکمل طریقہ پر ڈرو اور بغیر اسلام کے دنیا سے

مُّسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا

نہ اٹھنا ۔ اللہ کی ریسمان ہدایت کو مضبوط پکڑے رہو اور آپس میں جدائی نہ ڈالو اللہ کی

نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ

اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں کو ملا کر آپس میں

فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

بھائی بھائی بنا دیا ۔ تم جہنم کے کنارے تھے تمہیں اس سے بچا

فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾

لیا ۔ اللہ اسی طرح اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کر سکو ۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو خیر کی دعوت دے ، نیکیوں کا حکم دے ،

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴ وَلَا تَكُوْنُوْا

برائیوں سے منع کرے کہ یہی ہدایت یافتہ جماعت ہوگی ۔ خبرداران جیسے نہ بنو

كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَ

جنھوں نے آپس میں تفرقہ ڈالا اور نشانیوں کے آجانے کے بعد بھی

اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰۵ۙ

اختلاف پیدا کیاکہ ایسے لوگوں کے لئے بہت بڑا عذاب ہے ۔

(آلِ عمران ۱۰۲،۱۰۳،۱۰۴،۱۰۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حرفِ آغاز

## (طبع اوّل)

عام طور پر اس کرۂ زمین کے بسنے والے ہر انسان کو اپنے بارے میں کوئی نہ کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی ضرور ہوتی ہے۔

صاحب علم کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھ میں مرجعیت کی تمام صلاحیتیں جمع ہو گئی ہیں۔

طبیب یہ تصور کرتا ہے کہ سارا دستِ شفا میرے ہی ہاتھ لگ گیا ہے۔

الیکشن کے امیدواروں کو یہ خبط ہوتا ہے کہ ساری پبلک میری ہی فدائی ہے۔

اور جب ہر صنف کے آدمی کو کوئی نہ کوئی ناجائز تصور لاحق ہو جاتا ہے تو قلم کار کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ ہونا چاہئے۔ وہ کوئی زبان استعمال کرے، کیسے ہی محاورات لکھے، کسی طرح کیوں نہ ادائے مطالب میں قاصر رہے، خیال یہی کرتا ہے کہ میرے قلم کی گردش کے ساتھ پڑھنے والے کے دل و دماغ کو بھی رواں دواں رہنا چاہئے۔ اسے اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے کہ دنیا میں صاحبانِ نظر بھی ہوتے ہیں، اہل علم و ادب بھی وجود رکھتے ہیں، پڑھنے والوں کا اپنا ذوق بھی ہوتا ہے، ان کے مطالعہ کا ایک معیار بھی معین ہے ــــــ وہ جو کچھ سمجھتا ہے وہ اپنی ذات کو اور جو کچھ سوچتا ہے وہ اپنی ذات کے لئے ؎

اپنی تلوار کو بس حاصلِ دنیا سمجھے

میرے بعض احباب بھی وقتاً فوقتاً مجھے اسی خوش فہمی کا شکار بنانا چاہتے ہیں اور ان کی

ضرورت سے زیادہ تعریف مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ میں بھی کچھ ہوں یا ہو گیا ہوں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب تک خود فراموشی اور خود فریبی جیسے تمام خیالات سے دور ہوں۔

مجھ سے بارہا یہ تقاضا ہوا کہ قوم میں مترجم کا کوئی وقار نہیں ہوتا ہے۔ اہل علم و ادب کی محفل میں اسے کوئی مقام نہیں دیا جاتا ہے لہذا آپ بجائے اس ترجمہ و تلخیص کے مستقل مؤلف و مصنف بننے کا کام شروع کر دیجئے۔ یہی طریقہ قوم میں مقبولیت اور بزم ادب میں ایک جگہ حاصل کرنے کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

بات یقیناً صحیح ہے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ میں اپنی طبعی کمزوری کی بنا پر جس بات کا اہل نہیں ہوں نہ اس کا دعویٰ کرنے کی ہمت رکھتا ہوں اور نہ ویسا اقدام ہی کر سکتا ہوں میرے لئے یہ کہیں آسان تھا کہ مختلف کتابوں کے اقتباسات کو جمع کر کے مولف بننے کا شرف حاصل کر لیتا یا کسی ایک کتاب کی ترتیب و تنظیم کو زمانہ کے مطابق ڈھال کر مصنف کے لقب سے مشہور ہو جاتا ـــــ لیکن ضمیر اسے گوارا نہیں کرتا اور دل میں اتنی توانائی محسوس نہیں ہوتی ہے۔

میری نظرِ قاصر میں مؤلف و مصنف کا واقعی معیار بہت بلند ہے اس لئے میں نے اس شرف کو بزرگانِ قوم و ملت کے لئے وقف کر دیا ہے اور اپنے لئے ان کے افادات کو آپ تک پہنچا دینے ہی کو باعثِ صد شرف سمجھتا ہوں۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ فنِ تالیف و تصنیف کے لئے اصلی ماخذ کا بقدرِ ضرورت پیشِ نظر ہونا ضروری ہے۔ اس میں دوسروں کے بیانات پر اعتماد کر لینا بعض اوقات سخت پریشانی سے دوچار کر دیتا ہے اور سارا وقار مٹی میں مل جاتا ہے اور میرے لئے دشواری یہ ہے کہ فی الحال ایسے خزانوں تک رسائی تقریباً ناممکن ہے جہاں ایسے دریائے آبدار میسر ہو سکتے ہوں۔ اس لئے خدمتِ مذہب اور اجرِ آخرت کی تمنا میں اسی کام پر اکتفا کرتا ہوں۔ المیسور لا یسقط بالمعسور۔

حضرات چہاردہ معصومین علیہم السّلام کے بارے میں مختلف زبانوں اور بالخصوص اردو زبان میں کافی مواد جمع کیا جا چکا ہے اور تقریباً ہر معصومؑ کی سوانح حیات کو ایک خاص طریقہ سے مرتب کیا جا چکا ہے لیکن جہاں تک میرا مطالعہ گواہی دیتا ہے اب تک کسی مؤلف یا مصنف

نے اپنی کتاب میں کسی معصوم کی زندگی پر تحلیلی انداز سے نظر نہیں ڈالی ہے اور ان کی زندگی کا باقاعدہ تجزیہ مفصل طریقہ پر نہیں کیا ہے ـــــ خدا جزائے خیر دے ہمارے ان ارباب قلم کو جنھوں نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس موضوع پر قلم اٹھانے لگے۔ ابھی حال ہی میں حضرت ابوطالبؑ کی زندگی کے تاریخی تجزیہ پر علامہ عبداللہ الخنیزی کی کتاب آپ کے سامنے آچکی ہے ـــــ دل چاہتا تھا کہ کسی معصوم کے سوانح حیات بھی اسی انداز سے منظر عام پر لائے جائیں۔

جارج جرداق نے امیرالمومنینؑ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن بہرحال وہ ایک عیسائی مؤلف ہے جو مزاج اسلام سے مکمل واقفیت نہیں رکھتا ہے یا اس سے ہم آہنگ وہم رنگ نہیں ہے۔

میں نے جب سے علامہ اسد حیدر کی کتاب "الامام الصادق والمذاہب الاربعہ" دیکھی ہے میرے دل میں یہ شوق کروٹیں لیتا رہا ہے کہ کاش یہ کتاب منظر عام پر آجاتی اور ہماری زبان والے بھی اس کے مطالب سے استفادہ کر سکتے کہ یہ کتاب ہمارے مذہب کا مخصوص سرمایہ ہے اور اس سے مذہب جعفری کی حقانیت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اس کی عظمت و اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

کسے خبر تھی کہ قلم قدرت نے یہ خدمت بھی میری ہی قسمت میں لکھی ہے اور کون جانتا تھا کہ کاتب تقدیر نے یہ شرف مجھے ہی عطا کیا ہے۔ چنانچہ برادر محترم علی غضنفر صاحب کراروی اور جناب محترم ابرار حسین صاحب شیرازی جعفری کے تقاضے پر کمرہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی تمام مصروفیتوں کو چھوڑ کر کتاب کے ترجمہ میں لگ گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ترجمہ مکمل ہو گیا لیکن اس قسم کی تحلیلی کتابوں میں ایک عوامی نقص یہ ہوتا ہے کہ اس سے مکمل طور پر ممدوح کے حالات نہیں مل پاتے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک مختصر مقدمہ کا بھی اضافہ کر دیا جائے جس میں امام علیہ السلام کے مختصر تعارف کے ساتھ آپ کے بارے میں پیدا کئے جانے والے شبہات کا جواب بھی مندرج ہو۔

چنانچہ آپ کی زندگی کے بارے میں "ابوزہرہ" مصر کے مشہور قلم کار نے بھی ایک کتاب لکھی ہے

لیکن اس میں کافی حد تک خیانت و جنایت سے کام لیا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اس مقدمہ میں ان کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر دیا جائے۔

خدا کرے میری یہ کوشش آپ کو پسند آئے اور بارگاہِ احدیت میں مقبول ہو۔

میرے اس مقدمہ کا ماخذ حسب ذیل کتابیں ہیں :۔

۱۔ امام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ
۲۔ عقیدۃ الشیعہ فی الامام الصادقؑ
۳۔ دائرۃ المعارف
۴۔ منتہی الآمال
۵۔ منتخب التواریخ
۶۔ مناقب ابن شہر آشوب
۷۔ تذکرہ خواص الامہ
۸۔ اجوبہ مسائل جار اللہ

ـــــ السیّد ذیشان حیدر جوادی

# تعارف

## حضرت جعفرؑ ابن محمدؑ ابن علیؑ ابن حسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ

عربی زبان کے اعتبار سے جعفر وسیع نہر کو کہتے ہیں اور بعض روایات کی بنا پر جعفر جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔

غالباً آپ کا نام جعفر اسی مناسبت سے رکھا گیا تھا کہ آپ کے علوم و کمالات سے ایک دنیا نے استفادہ کیا ہے اور اس سرچشمۂ فیوض و برکات سے یگانہ و بیگانہ ہر ایک سیر و سیراب ہوتا رہا ہے۔

**القاب** یوں تو آپ کے القاب فاضل، طاہر، قائم، صابر، مصدق، محقق، کاشف الحقائق وغیرہ سبھی کچھ ہیں۔ لیکن مشہور ترین لقب صادق ہے جس کے اسباب پر آئندہ روشنی ڈالی جائے گی اور یہ واضح کیا جائے گا کہ جس طرح کفارِ قریش نے رسول اکرمؐ کی رسالت سے انکار کے باوجود ان کی صداقت کا کلمہ پڑھا تھا اسی طرح آپ کی صداقت کو بھی ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ روایات عصمت کی بنیاد پر اس لقب سے خود رسول کریمؐ نے آپ کو یاد کیا تھا۔ بعض دیگر احادیث میں آپ کو عالم اور شیخ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جس سے آپ کی بلند پایہ عالمانہ صلاحیت اور بے پناہ بزرگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لفظ صادق کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ جعفر نام کے ایسے افراد بھی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے غلط طریقہ سے دعویٰ امامت کیا یا ان کا کذب شہرۂ آفاق ہو گیا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ایسے افراد سے امتیاز قائم کرنے کے لئے لفظ صادق کو آپ کے نام کا جز قرار دے دیا

جائے تاکہ دونوں جعفر ایک دوسرے سے الگ رہ سکیں۔

**ولادت** ۱۷ ربیع الاوّل ۸۳ھ روز جمعہ وقت طلوعِ فجر وہ مبارک ساعت تھی جب صادق و امین کی شریعت کا سچا امانت دار اس دنیا میں آیا اور اپنے ابتدائے وجود ہی سے یہ اعلان کرتا ہوا آیا کہ جس طرح شریعتِ اسلام کا بانی ۱۷ ربیع الاوّل کو اس عالم ظہور میں جلوہ گر ہوا تھا اسی طرح شریعت کے مٹے ہوئے نقوش کو دوبارہ ابھارنے والا اور اسلام کے پامال شدہ احکام کو از سرِ نو زندہ کرنے والا نبی کا سچا جانشین بھی اسی تاریخ کو اس دارِ دنیا میں جلوہ نما ہوا ہے۔ تاریخ ولادت کا اتحاد اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ نبی کا یہ وارث تاریخی اعتبار سے نبوت کی ابتدا سے ہم آغوش ہے اور یہ فال نیک اربابِ بصیرت کے لئے ایک مژدہ جاں فزا ہے۔

**نسب شریف** آپ کے والد ماجد حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام ہیں جن کو خود سرکارِ رسالت نے اوّلین و آخرین کے علوم کا وارث قرار دیا ہے اور آپ کی والدہ ماجدہ حضرت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر کی صاحبزادی ہیں۔ جن کا نام فاطمہ ہے اور ام فروہ کنیت، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نسبی اعتبار سے ایک طرف سے فرزند امام ہیں تو دوسری طرف سے اس آزاد فکر، حریت پسند مجاہد کے پرنواسہ ہیں جس نے نسب سے ملتی ہوئی ظاہری شرافت کو ٹھوکر مار دی اور اپنے معنوی کمالات کو اتنا اجاگر کیا کہ خود امیرالمومنینؑ حضرت علیؑ کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ محمدؒ میرا بیٹا ہے ابوبکر کے صلب سے۔ امام محمد باقرؑ کا ام فروہ سے عقد کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اسلام مین ازدواج کا معیا شرافتِ کردار ہے۔ خاندان و خانزادہ نہیں ہے۔

**وفات** آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں چند اقوال ملتے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ نے پندرہ رجب کو رحلت فرمائی ہے۔ بعض نے پندرہ شوال کہا ہے اور بعض ۲۵ ر شوال کہتے ہیں اور بعض ۲۵ ر رجب۔

روزِ وفات کے سلسلہ میں دو قول ہیں یکشنبہ دوشنبہ لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ آپ نے ۶۵ سال کے سن میں ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا ہے اور جنت البقیع میں

دفن ہوئے۔ آپ کے ایک صاحبزادے حضرت اسمٰعیل تھے جن کے بارے میں لوگوں کو امامت کا شبہ تھا اور انھوں نے آپ کی زندگی ہی میں انتقال فرمایا تھا لیکن خدا برا کرے طمع دنیا اور حبِ ریاست کا کہ آپ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ افطح نے امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کے مقابلہ میں دعویٰ امامت کر دیا اور یہ ارادہ کیا کہ باپ کے جنازہ پر نماز بھی ادا کریں لیکن وارث حقیقی نے خالقِ کائنات کی مشیت سے ایسے معجزات ظاہر کر دیئے کہ قوم پر عبداللہ کی حقیقت ظاہر ہو گئی اور یہ عقیدہ منظرِ عام پر آگیا کہ امام کی نمازِ جنازہ امام ہی پڑھا سکتا ہے۔

## خصوصیات

یوں تو خالقِ کائنات کے معین کئے ہوئے ہر ہادی اور پیشوا میں مختلف خصوصیات اور بے پناہ علمی کمالات پائے جاتے ہیں لیکن زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کی بنا پر ہر خلیفۃ اللہ کو اتنا موقع نہیں مل پاتا کہ وہ جملہ کمالات کا اظہار کر سکے اس لئے جو کمال بھی کسی امام سے مکمل طور پر ظاہر ہوتا ہے اسے اس کی خصوصیات میں شمار کر لیا جاتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے امام جعفر صادقؑ میں یہ پانچ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔

۱۔ آپ سے اتنے علوم و کمالات اور احکام و تعلیمات ظاہر ہوئے ہیں کہ چودہ معصومینؑ کے مکمل کردار سے مرتب کیا ہوا مذہب بھی آپ کی ذاتِ مبارک کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔

۲۔ آپ سے فریقین کے اتنے افراد نے استفادہ کیا ہے کہ اتنی تعداد کسی امام کے شاگردوں کی نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ آپ کے مدرسہ کے پڑھے ہوئے بچے جو کل طفلِ مکتب کہے جاتے تھے آج امامِ مذہب کہے جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اگر خدائی سلسلۂ امامت کے وارث ہیں تو عوامی سلسلۂ امامت کے مورث بھی ہیں۔

۳۔ آپ سے جس قدر علوم و فنون کا اشتہار ہوا ہے اتنا تاریخ عصمت کے کسی دور میں نہیں ہو سکا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ آپ کے صرف ایک شاگرد جابر ابن حیان کے علوم پر مشرق و مغرب دونوں ناز کر رہے ہیں۔

۴۔ آپ کا دور وہ تھا جب درس و تدریس کا سارا سلسلہ آپ ہی کی ذات تک منتہی ہوتا

تھا اور مذہب کے سارے ذمہ دار آپ ہی کے مدرسہ کے شاگرد تھے۔

۵۔ رسول اکرمؐ کی طرح آپ کی صداقت بھی شہرۂ آفاق اور ضرب المثل تھی۔ کسی انسان سے آج تک یہ جرأت نہیں ہو سکی ہے کہ وہ آپ کی صداقت پر حرف لا سکے اور درحقیقت ایسے ہی صادق افراد ہوتے ہیں جن کے ساتھ رہنے کا قرآن مجید حکم دیتا ہے۔ کونوا مع الصادقین۔

## شخصیت

ارباب فکر و نظر اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت پر تبصرہ کرنا اور وہ بھی اتنے مختصر وقت میں انتہائی دشوار گذار امر ہے۔ قاعدہ کے اعتبار سے تو اس کی ضرورت بھی نہ ہونی چاہئے تھی کہ نبیؐ کے علوم و کمالات کا وارث اور ائمہ مذاہب کا استاد کسی طرح بھی اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ اس کی شخصیت کو نمایاں کیا جائے یا اس کی عظمت پر تبصرہ کیا جائے۔ مشک کی خوشبو کسی عطار کے کہنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتی ہے۔ لیکن خدا برا کرے سیاسی اغراض اور نفسانی امراض کا کہ انھوں نے نہ کسی صاحب کمال کے کمال کو ظاہر ہونے دیا اور نہ کسی صاحب صلاحیت کی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے دیا بلکہ ہمیشہ اپنی خواہش پرستی سے یہی چاہا کہ تخت و تاج اپنے ہاتھ میں رہے اور تاریکیٔ زنداں صاحب علم و کمال کی قسمت میں لکھ دی جائے۔ اقتدار حاکم جور کے قبضہ میں رہے اور خانہ نشینی صاحب استعداد و صلاحیت کے حصہ میں آئے۔ اور اگر سیاسی مقاصد اتنی سی بات سے بھی حاصل نہ ہو سکیں تو اس پر الزامات لگائے جائیں، اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا کیا جائے اور اس کے بارے میں ہر اس سازش کو روا رکھا جائے جو سیاست کے حق میں مفید ثابت ہو اور جس سے حاکم وقت کے دل کو تسکین حاصل ہو سکے۔

کیا تاریخ اس موقع کو بھلا دے گی جب امیر شام کے دربار میں مسلمانوں کے متفق علیہ خلیفہ اور والیٔ امر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے نسب سے انکار کیا گیا اور ان کو نبیؐ کا بیٹا کہا گیا اور فاطمہؑ کا باپ۔

اور کیا ارباب نظر اس موقع کو فراموش کر دیں گے جب حضرت علیؑ کو گرفتار کر کے دربار خلافت میں لایا گیا اور آپ نے فرمایا کہ مجھے قتل کر دینا، ایک اللہ کے بندہ اور نبیؐ کے

بھائی کا قتل ہو گا۔ تو حضرت عمر نے جواب دیا کہ ہم آپ کو اللہ کا بندہ تو تسلیم کرتے ہیں لیکن نبی کا بھائی نہیں مانتے ہیں اور حضرت ابو بکر اس منظر کو نہایت خاموشی سے دیکھتے رہے۔

(الامامۃ والسیاسۃ ص۱۳)

ظاہر ہے کہ جو امت ایسے کھلے ہوئے حقائق کے انکار کی عادی ہو گئی ہو اور جو اہل قلم اپنے قلم کو حکومتِ وقت کے ہاتھ بیچ چکے ہوں، جو اربابِ فکر و نظر اپنی صلاحیتوں کو حکومت کے غلط کردار کی تاویل کے لئے وقف کر چکے ہوں اور جو صاحبانِ تاریخ اپنی تاریخ کو کردار کا آئینہ بنانے کے بجائے حاکمِ وقت کے کردار کو اپنی تاریخ کا آئینہ بنانے پر تلے ہوئے ہوں ان سے یہ توقع رکھنا ہی بیکار ہے کہ وہ نبیؐ کے اس وارث کے فضل و کمال کو نگاہِ اعتبار سے دیکھیں گے اور اس کی شخصیت کا مکمل طور سے اعتراف کریں کر سکیں گے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں ہے آپ ابن کثیر کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں ایک طرف تو بدکردار، بے ایمان اور غدار افراد کی مدح سرائی میں کتاب کے صفحات کو سیاہ کر کے صفحۂ قلب کا آئینہ بنایا گیا ہے اور دوسری طرف ۱۴۸ھ کے حالات میں فقط یہ ایک فقرہ ذکر کیا گیا ہے کہ اسی سال امام جعفر صادقؑ کا انتقال ہوا۔

انصاف سے بتائیے کہ کیا کوئی علمی غیرت رکھنے والا انسان اس ظلم پر خاموش رہ سکتا ہے؛ کیا امام جعفر صادقؑ کی شخصیت اس قابل بھی نہ تھی کہ ان کے بارے میں چند سطریں لکھ کر ان کی عظمت کا اعتراف کر لیا جاتا؛

اس کے بعد مروج الذہب جلد ۳ ص۲۱۲ کو اٹھا کر دیکھیں جس کی تصحیح علامہ محمد محی الدین نے فرمائی ہے کہ اس میں امام صادقؑ کے حالات کا مختصر تذکرہ محمد ابن جعفر علوی کے نام سے کیا گیا ہے۔

آپ اسے کاتب کی غلطی کہیں یا پریس کی فروگذاشت، لیکن اتنا ضرور کہا جائے گا کہ اگر علامۂ موصوف کو امام صادقؑ کے حالات سے کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو اس غلطی کی طرف ضرور متوجہ ہوتے۔

ان دونوں کے بعد استاد محمد ابو زہرہ کی باری آتی ہے۔ آپ نے بظاہر امام جعفر صادقؑ

کے حالات میں کتاب تالیف کر کے پوری امتِ اسلامیہ اور بالخصوص مذہب شیعہ پر احسان کیا ہے لیکن آپ کا واقعی مقصد آپ کے اندازِ نگارش اور اسلوبِ بحث سے صاف ظاہر ہوتا ہے جہاں امام کی توہین اور ان کی شخصیت پر اعتراضات کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا ہے۔

خود اپنے یہاں مسٹر امیر علی کی تاریخ اسلام کو دیکھ لیجئے جس میں بنی عباس کے طرزِ حکومت پر ورق کے ورق سیاہ کئے گئے ہیں۔ بنی امیہ کے اندازِ سلطنت کو تفصیلی طور پر جگہ دی گئی ہے لیکن امام جعفر صادقؑ کے علمی خدمات کو صرف ایک سرسری نظر سے دیکھا گیا ہے اور قیامت یہ ہے کہ اس کا نام تاریخ اسلام رکھا گیا ہے۔ گویا ہمارے مصنف نما مصنف کی نظر میں اسلام اقتدار کی تنظیم اور حکومت کے سدھارنے کا نام ہے اور اس میں علمی خدمات، ذہنی تربیت اور مستحکم تبلیغ کا کوئی درجہ نہیں ہے؛ —— چھوڑیئے کہاں تک اس داستانِ غم کو سنایا جائے گا اور کب تک آپ اسی انداز سے ان قصوں پر آنسو بہاتے رہیں گے۔

آیئے ذرا اسی مسخ شدہ، اوہام پرست، تابع اقتدار اور دشمنِ امامؑ تاریخ کے آئینہ میں امام کی عظمت و شخصیت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کردار کی بلندی اور کمالات کی رفعت کس طرح سروں کو جھکا لیتی ہے اور دلوں کو کھینچ لیتی ہے۔ فضیلت وہی ہے جس کی گواہی مخالف یا مخالف کی تاریخ دے۔ اس سلسلہ میں مجھے کسی تفصیلی بیان کی ضرورت نہیں ہے صرف زیرِ نظر کتاب کے عطر بار کلمات کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

## علمی خدمات

تاریخ عالم میں دو ہی شخصیتیں ملتی ہیں جنھیں منظم طور پر علمی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے اور جن کے اپنے علوم و کمالات سے ایک پورا مکتبِ خیال فیض یاب ہوا ہے۔

تاریخِ یونان میں افلاطون اور تاریخ اسلام میں امام جعفر صادقؑ۔ افلاطون کی اہمیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس نے بکھرے ہوئے علمی شہ پاروں کو ایک مرکز پر جمع کر کے طالبانِ علم و معرفت کے لئے ایک مدرسۂ فکر قائم کر دیا تھا جسے آج تک افلاطون اکیڈمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود افلاطون کے اس مدرسہ کو وہ خصوصیات نہ حاصل ہو سکیں جو امام جعفر صادقؑ کے مدرسہ کو حاصل ہوئیں جس کے بعض اسباب یہ ہیں:

۱۔ افلاطونی دور میں انسانی ذہن اس منزلِ کمال تک نہ پہنچا تھا جہاں دوسری صدی ہجری میں پہنچ گیا تھا۔

۲۔ افلاطون کے دور میں انسانی علوم گھٹنیوں چل رہے تھے اور امام صادقؑ کے زمانہ میں یہی کمالات معراج منزل سے ہم کلام تھے۔

۳۔ افلاطون کے مدرسہ میں جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی وہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ایک سطحی بات سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتے ہیں۔

۴۔ افلاطون کے مدرسہ میں تحصیل علم کرنے والے صرف اپنے عقیدت منداور مخلص شاگرد تھے۔

لیکن امام کا جو مدرسۂ فکر کوفہ میں قائم ہوا تھا اس کی نوعیت ان تمام تنظیموں سے جداگانہ تھی۔ یہاں طالبانِ علم صرف عقیدت مند نہ تھے بلکہ بیگانوں کی بھی ایک کثیر تعداد تھی۔ یہاں ناپختہ دماغ اور نارسا ذہنوں کی تربیت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ بڑے بڑے عظماءِ قوم اور ائمہ مذاہب زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ یہاں جن علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ ایسے ٹھوس عقائد تھے جن کی قدر آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سرکار رسالتؐ، امیرالمومنینؑ یا ان کے بعد کے ائمہ ہدیٰ کو بھی اگر یہ ماحول نصیب ہو جاتا تو وہ بھی یہی تنظیم قائم کرتے جو امام جعفر صادقؑ نے قائم کی تھی لیکن اسے کیا کیا جائے کہ حالاتِ زمانہ نے یہ بات اسی وارثِ رسولؐ کے لئے اٹھا رکھی تھی چنانچہ آپ نے بھی دوسری صدی ہجری کے اس ابتدائی دور سے جس میں بنی امیہ کی تقدیر پلٹ رہی تھی اور ان کا تخت و تاج مٹتا ہوا نظر آرہا تھا۔ بنی عباس ہوس اقتدار اور خواہشِ حکومت میں جابجا بغاوتیں اور انقلاب برپا کر رہے تھے، پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور تبلیغِ دین و ترویج مذہب کے لئے ایک مسلسل علمی رابطہ قائم کر دیا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ بنی فاطمہؑ کے لئے اتھاہ مصائب نے عوامی ذہنیت کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ بنی عباس یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ان کی بغاوت صرف آل محمدؐ کے نام پر کامیاب ہو سکتی ہے چنانچہ ان لوگوں نے بھی تمام انقلابات کی بنیاد آلِ رسولؐ

کو ان کے جائز حقوق دلانے پر رکھی۔ جس کی وجہ سے امام صادقؑ کو اتنا موقع مل گیا کہ آپ اپنے علوم و کمالات سے ایک دنیا کو فیض یاب کر سکیں۔

یہاں تک آنے کے بعد سیاست اور امامت کا فرق بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ آنے والی حکومت یہ سوچ رہی تھی کہ جب ہماری بغاوتیں آل محمدؐ کے نام پر ہوئی ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہمیں اپنا محسن سمجھ کر ابن الوقت علماء کی طرح ہمارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ ابو ہریرہ کی سی معاویہ پرستی کا مظاہرہ کریں گے، ابن عمر کی یزید نوازی کا منظر پیش کریں گے، انس بن مالک کے ضعیف حافظہ کی تاریخ دہرائی جائے گی اور حقائق و مسلّمات سے انکار کر کے حکومتِ وقت کی فضیلت میں حدیثیں تیار کی جائیں گی۔

اس خواہش پرست سیاست نے حکومت اور امامت کے فرق کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔

اس نے یہ نہ سوچا کہ آل محمدؐ حکومت کے بھوکے یا اقتدار کے پیاسے نہیں ہیں۔ انھیں اگر مظالم سے مہلت ملتی ہے، تو موقع کو غنیمت جان کر ترویج دین میں صرف کر دیتے ہیں۔ امام صادقؑ کے لئے کتنا نادر موقع تھا کہ وہ باغی جماعت کا سہارا لے کر اور اس کی سرپرستی قبول فرما کر کرسیٔ حکومت پر آجاتے لیکن آپ نے یہ طے کر لیا کہ اس طرح میرے اوقات کا زیادہ حصہ شورشوں کے دبانے اور بغاوتوں کے کچلنے میں صرف ہو جائے گا اور دین الٰہی پھر انھیں حالات سے دوچار ہو جائے گا جن کا آج تک مقابلہ کرتا رہا ہے اور یہ بات اپنے واقعی مقصد اور فرض منصبی کے خلاف ہے لہٰذا آپ نے سب کو ٹھکرا کر اپنا علمی کام شروع کر دیا۔

حکومتِ وقت کو بظاہر آپ کے اس اعراض و کنارہ کشی سے خوش ہونا چاہئے تھا لیکن وہ تو کسی اور بات کی توقع میں تھی۔ چنانچہ منصور نے اپنے مقصد کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر امام کی مخالفت کا اعلان کر دیا اور درپردہ اذیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

امام نے بھی چاہا کہ عزم و استقلال کا سہارا لے کر اپنے مدرسہ کی بقا کا انتظام کریں اور ہوس پرست حکومت کو یہ سمجھا دیں کہ ہم کسی آن بھی حکومت و اقتدار کے طالب نہیں ہیں۔ یہ اقتدار و حکومت تو ہمارے نام پر مانگی ہوئی ایک بھیک کا نام ہے۔

مثل مشہور ہے کہ جتنا انسان کی نیت میں خلوص ہوتا ہے اتنا ہی اس کا کام پائیدار ہوتا ہے۔
امام صادقؑ کے حسنِ نیت اور اخلاص نظر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری صدی کا قائم کیا ہوا یہ مدرسہ آج بھی ظہر کوفہ (نجف) میں پوری آب وتاب کے ساتھ علمی خدمت انجام دے رہا ہے اور اپنی اسی روایت کو باقی رکھے ہوئے ہے کہ حکومتِ وقت مخالفت کرتی ہے تو کرے۔ انسان کو اپنے عزم واستقلال کا سہارا لے کر دین کی خدمت کرتے رہنا چاہئے۔

امام جعفر صادقؑ کے مدرسہ میں پڑھنے والے افراد بچے یا نوجوان نہیں تھے بلکہ بڑے بڑے بزرگانِ قوم اور فلاسفۂ وقت آپ کی شاگردی سے استفادہ کرتے رہے۔ آپ کا مدرسہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے کہ تاریخ نے اب تک کسی ایسے مدرسے کی نشاندہی نہیں کی ہے جس میں بیک وقت چار ہزار فلاسفہ ومفکرین اور اربابِ نظر تحصیل علم کرتے ہوں اور نہ اس کا کوئی اقتصادی نظام ہو اور نہ سیاسی استحکام۔

امام کے شاگردوں کے بارے میں حافظ ابو العباسؒ ابن عقدہ، شیخ مفیدؒ، شیخ محمد ابن علی فتال، سید علیؒ ابن عبد الحمید، شیخ طبرسیؒ، ابن شہر آشوب محقق حلیؒ، شہید اول، شیخ حسین والد علامہ بہبہانی کا بیان ہے کہ ان کی تعداد چار ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔
(ارشاد۔ کتاب الانوار۔ اعلام الوریٰ۔ مناقب۔ معتبر۔ ذکریٰ وغیرہ)

ان شاگردوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو مذہبی اعتبار سے آپ کے مخالف رہے اور ایک پورے مکتبِ خیال کے بانی کہلائے۔ جیسے:۔

۱۔ ابو حنیفہ نعمان ابن ثابت متوفی ۱۵۰ھ۔ جن کا خیال تھا کہ جعفرؑ ابن محمدؑ سے بڑا عالم پیدا ہی نہیں ہوا ہے اور اکثر اس بات کا اعلان بھی کرتے رہتے تھے کہ اگر دو سال ان کی شاگردی کا شرف حاصل نہ کرتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ استاد ابو زہرہ نے امام ابو حنیفہ کے اس مشہور فقرہ کا انکار کرتے ہوئے اسے شیعوں کی ساختہ و پرداختہ روایت قرار دیدیا ہے اور اتنی مقدار میں بھی مطالعہ کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی کہ محدث دہلوی کی تحفۂ اثنا عشریہ ہی کا مطالعہ کر کے یہ فیصلہ کر لیتے کہ یہ فقرہ شیعوں کا ساختہ و پرداختہ ہے یا امام ابو حنیفہ

کا اعتراف فضل و کمال ؟

۲۔ مالک بن انس متوفی ۱۷۹ھ۔ جن کا مشہور مقولہ تھا کہ آنکھوں نے حضرت جعفرؑ ابن محمدؑ سے بہتر انسان نہیں دیکھا ہے۔

۳۔ سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ۔ جن کا مذہب چوتھی صدی کے بعد تک رائج رہا۔ اور جنھوں نے آداب، اخلاق اور موعظ کی بکثرت حدیثیں امام سے نقل کی ہیں۔

۴۔ سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ۔ جن کا مذہب ایک مدت تک رائج رہا اور اس کے بعد ختم ہو گیا۔

۵۔ شعبہ بن حجاج متوفی ۱۶۰ھ۔ جن کی بکثرت حدیثیں کتب صحاح میں پائی جاتی ہیں اور جن کے بارے میں امام شافعی کا قول تھا کہ اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث نہ ہوتی۔ امام احمد فرماتے تھے کہ شعبہ مستقل ایک امت ہے۔

۶۔ فضیل بن عیاض متوفی ۱۸۷ھ۔ جن کی روایتیں بخاری، ترمذی، مسلم، نسائی سبھی نے نقل کی ہیں۔

۷۔ حاتم بن اسمٰعیل متوفی ۱۸۰ھ۔ جن کی روایتیں بخاری، ترمذی، مسلم وغیرہ نے نقل کی ہیں۔

۸۔ حفص بن غیاث متوفی ۱۹۴ھ۔ بغداد و کوفہ کے قاضی اور ایسے اچھے حافظہ کے مالک تھے کہ تین چار ہزار حدیثیں زبانی بیان کر دیا کرتے تھے۔

۹۔ زبیر بن محمد متوفی ۱۶۲ھ۔ جن کی روایتیں کتب صحاح میں مذکور ہیں۔

۱۰۔ یحییٰ بن سعید بصری متوفی ۱۹۸ھ۔ ان کی روایتیں بھی کتب صحاح میں موجود ہیں۔

۱۱۔ اسمٰعیل بن جعفر انصاری متوفی ۱۸۰ھ۔ مدینہ کے رہنے والے تھے لیکن بغداد میں آکر انتقال فرمایا۔ ان کی روایتیں بخاری، مسلم وغیرہ نے نقل کی ہیں۔

۱۲۔ ابراہیم بن محمد مدنی متوفی ۱۹۱ھ۔ یہ صاحب تصنیف تھے اور شافعی کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ شافعی نے اپنی کتاب میں اکثر ان لوگوں کی روایتیں نقل کی ہیں۔ ان بزرگوں کی توہین سے صرف اس بنیاد پر متہم کیا گیا کہ یہ اہلبیتؑ کی حدیثیں زیادہ روایت

کرتے تھے۔

۱۳۔ ضحاک۔ بن مخلد متوفی ۲۱۴ھ۔ انھوں نے بھی امام صادقؑ کی حدیثیں روایت کی ہیں۔

۱۴۔ محمد۔ بن فلیح مدنی متوفی ۱۷۰ھ۔ جن کی روایتیں بخاری، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ نے نقل کی ہیں۔

۱۵۔ عبدالوہاب بن عبدالمجید متوفی ۱۹۴ھ۔ یہ ایک دولت مند بزرگ تھے اور ہر سال دو لاکھ چالیس ہزار کا غلّہ اصحاب حدیث میں صرف کیا کرتے تھے۔

۱۶۔ عثمان۔ بن فرقد بصری۔ ان کی روایت بخاری و ترمذی میں موجود ہے۔

۱۷۔ عبدالعزیز۔ بن عمران متوفی ۱۹۷ھ۔ ان کی روایت ترمذی نے نقل کی ہے۔

۱۸۔ عبداللہ۔ بن دکین۔ ان کی روایت بخاری نے ادب المفرد میں نقل کی ہے۔

۱۹۔ زید۔ بن عطا جن کی حدیثیں نسائی و ترمذی نے نقل کی ہیں۔

۲۰۔ مصعب۔ بن سلام کوفی۔ جن کو ابو حاتم نے محلّہ صداقت کا شیخ قرار دیا ہے۔

۲۱۔ بشیر بن میمون خراسانی متوفی ۱۸۴ھ۔ جن کی روایت ابن ماجہ نے بیان کی ہے۔

۲۲۔ ابراہیم۔ بن سعد زہری متوفی ۱۸۲ھ۔ جو احمد ابن حنبل کے استاد تھے۔

۲۴۔ حارث بن عمیر جو مکہ میں امام صادقؑ سے روایت کرتے تھے۔

۲۵۔ مفضل۔ بن صالح کوفی۔ ترمذی کے راوی ہیں۔

۲۶۔ ایوب۔ بن تمیمہ متوفی ۱۲۱ھ۔ جو اعمش اور قتادہ کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔

۲۷۔ عبدالملک۔ بن جریج متوفی ۱۴۹ھ۔ جن کو اسلام میں پہلا مصنف کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بکثرت افراد ہیں جو امام صادقؑ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد تھے اور آپ سے روایتیں بیان کیا کرتے تھے۔ جن کے ناموں کی تفصیل کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ (تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب التہذیب، میزان الاعتدال، تذکرۃ الحفاظ، خلاصہ جزری، تاریخ بغداد، الجرح والتعدیل، ابن ابی حاتم وغیرہ)

مذکورہ بالا افراد تو وہ تھے جو مذہب و مسلک کے اعتبار سے امام جعفر صادقؑ سے الگ مکتب خیال کے بانی ہو گئے تھے ورنہ وہ افراد جو آخر وقت تک امام کے مسلک پر قائم رہے

ان کی تعداد تو ایک لامحدود حیثیت رکھتی ہے اور عجب نہیں ہے کہ چار ہزار کی تعداد انھیں حضرات سے پوری ہوئی ہو۔ جیسا کہ علی ابن وشار کا بیان ہے کہ میں نے مسجد کوفہ میں نوسو حلقہ درس ایسے دیکھے ہیں جن میں ہر استاد یہ بیان کر رہا تھا کہ میرے سارے علوم اور ساری روایتیں حضرت جعفرؑ ابن محمدؐ سے حاصل کی ہوئی ہیں۔

یہی وہ افراد تھے جن کی چار سو کتابیں مذہبِ شیعہ کی چار بنیادی کتابوں کا ماخذ تھیں اور جن میں سے بعض حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں :-

۱۔ **ابان بن تغلبؒ** ــــ یہ وہ جلیل القدر صحابی تھے جنھوں نے امام زین العابدینؑ امام محمدؑ باقر اور امام جعفر صادقؑ تینوں حضرات سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے وثوق واعتبار کا یہ عالم تھا کہ امام باقرؑ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ تم مسجدِ مدینہ میں بیٹھ کر لوگوں کو فتویٰ دو۔ میں اپنے شیعوں میں تم جیسے افراد کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس روایت میں فتویٰ کا لفظ بتا رہا ہے کہ امامؑ کی زندگی میں فتویٰ کا سلسلہ باقی رہ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ معصومؑ کی نص کے مقابلہ میں کوئی اجتہاد نہیں ہو سکتا ہے۔

ابن ندیم نے اپنی فہرست صفحہ ۳۰۸ پر آپ کے مختلف تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ **ابانؒ بن عثمان** ــــ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ امام جعفر صادقؑ اور امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت کیا کرتے تھے۔

محمد ابن عمیر نے آپ کے حافظہ کی یہ تعریف کی ہے کہ جب کسی کتاب کو پڑھ لیتے تھے تو اسے من وعن دہرا دیا کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۹۳)

۳۔ **بکیر بن اعین** ــــ زرارہ کے بھائی امام باقرؑ وصادقؑ کے راوی تھے۔ جلالتِ قدر کا یہ عالم تھا کہ جب امام صادقؑ کو ان کے انتقال کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ بکیر پیغمبرِ اسلامؐ اور امیر المومنینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اللہ بکیر پر رحمت نازل کرے وہ ایک مردِ معتبر تھے۔

۴۔ **جمیلؒ بن دراج** ــــ امام جعفر صادقؑ و امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت کیا کرتے تھے۔

۵۔ حمّادؒ بن عثمان ـــــ امام صادقؑ، امام کاظمؑ اور امام رضاؑ سے روایت کیا کرتے تھے۔

۶۔ حارثؒ بن مغیرہ ـــــ امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام کاظمؑ سے حدیثیں نقل کرتے تھے۔

۷۔ معلیٰ بن خنیس ـــــ امام جعفر صادقؑ کے مخصوص اصحاب میں شمار ہوتے تھے جب امیرِ وقت داؤد کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت سے خاص تعلق رکھتے ہیں تو اس نے انھیں قتل کرادیا اور سارا مال لوٹ لیا۔

امام علیہ السّلام کو اس کی اطلاع ملی تو آپ داؤد کے پاس تشریف لے گئے اور غضبناک لہجہ میں فرمایا۔ تو نے میرے دوست کو قتل کیا ہے اور میرے مال کو لوٹ لیا ہے؛

داؤد نے یہ عالم دیکھ کر بات کو چھپانے کے لئے پولیس آفیسر کو قصاص کے طور پر پھانسی کا حکم دے دیا لیکن قدرتِ خدا کہ اس نے تختۂ دار سے یہ اعلان کر دیا کہ لوگ خود ہی قتل کراتے ہیں اور اس کے بعد حکم کی تعمیل کرنے والے کو بھی قتل کرا دیتے ہیں۔

۸۔ زرارہؒ بن اعینؒ ـــــ ان کی منزلت یہ تھی امام جعفر صادقؑ نے فیض ابن مختار کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تمھیں حدیثوں کی ضرورت ہو تو زرارہ کی طرف رجوع کیا کرو۔

دوسرے موقع پر فرمایا کہ میں زرارہ کی مذمّت اس لئے کر دیتا ہوں کہ زرارہ میرے مخصوص اصحاب میں شمار ہوتے ہیں اور حکومت کی نظروں میں چڑھ گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حکومت انھیں کوئی نقصان پہنچا دے۔

ان کی مثال اس کشتی کی ہے جسے جناب خضرؑ نے بادشاہ کے خوف سے معیوب بنا دیا تھا۔

۹۔ عبدالملک بن اعین ـــــ علمِ نجوم میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ مجھے ستاروں پر تھوڑا تھوڑا سا اعتماد ہوتا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس علم کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؛

آپ نے فرمایا کہ ان کتابوں میں آگ لگا دو۔

جلالتِ قدر کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کے عراق سے امامؑ کی خدمت میں آنے پر تعجب کرتے تھے تو حضرت فرماتے کہ یہ میرے پدر بزرگوار کے اصحاب میں ہیں۔

۱۰۔ علیؒ بن یقطین ـــــ انھوں نے امام جعفر صادقؑ سے صرف ایک روایت نقل کی ہے لیکن امام موسیٰ کاظمؑ سے بکثرت روایتیں نقل کی ہیں۔ جن میں چند عبرتناک اور ایمان افروز قصے بھی ہیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے امام کاظمؑ سے وضو کا مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے اہل سنت کے طریقے سے وضو کرنے کا حکم دے دیا۔

علی ابن یقطین کو سخت تعجب ہوا لیکن حکم امام پر عمل پیرا ہو گئے۔ ادھر لوگوں نے ہارون رشید سے ان کی شکایت کر دی کہ یہ شیعہ ہیں۔ اس نے امتحان کے طور پر خفیہ طریقہ سے ان کے وضو کا جائزہ لیا اور جب اپنا ہم خیال دیکھ لیا تو اپنے درباریوں کی سخت مذمت کی۔ جس سے اہل معرفت کو امام کی منزل علم کا صحیح اندازہ ہو گیا اور تقیہ کی مصلحت بھی کھل کر سامنے آگئی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہارون رشید نے علی بن یقطین کو کچھ جائزے عطا کئے۔ انھوں نے سب امامؑ کے پاس بھیج دیئے۔ حضرت نے سب کو قبول کر لیا لیکن خلعتِ شاہی کو واپس کر دیا۔ ادھر لوگوں نے بادشاہ سے یہ شکایت کی کہ یہ موسیٰؑ ابن جعفرؑ کو امام سمجھ کر سارا مال ان کے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔

ہارون رشید نے ان کے گھر کی تلاشی لی اور جب وہ خلعت برآمد ہو گیا تو علی ابن یقطین کو پچاس ہزار درہم بطور انعام دیئے اور شکایت کرنے والے کو ہزار کوڑے لگوائے۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم ابن جمال، علی ابن یقطین کے پاس ملنے کے لئے آئے تو انھوں نے ملاقات کرنے سے معذرت ظاہر کر دی۔

جس کے بعد علی ابن یقطین امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے بھی ملنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جب تک تمھیں ابراہیم معاف نہ کرے گا میں معاف

نہین کرسکتا ہوں۔ علی ابن یقطین یہ سن کر اعجاز امامؑ سے مدینہ سے کوفہ پہنچے اور ابراہیم سے یہ درخواست کی کہ ان کے رخسار کو اپنے پیروں سے کچل دیں تاکہ انانیت کا تصور ہی ذہن سے نکل جائے۔

ابراہیم نے اس جسارت سے انکار کر دیا لیکن جب ادھر سے اصرار بڑھتا ہی گیا تو ان کی خواہش پر عمل کیا۔

علی ابن یقطین یہ کہتے جاتے تھے "خداوندا تو گواہ رہنا" اب جو پلٹ کر مدینہ آئے تو امامؑ نے فوراً ملاقات کی اجازت دے دی اور ابن یقطین کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

چوتھا واقعہ یہ ہے کہ علی ابن یقطین نے امام موسیٰ کاظمؑ سے اس بات کی اجازت چاہی کہ ہارون کی وزارت سے مستعفی ہو جائیں تو آپ نے یہ کہہ کر روک دیا کہ یہ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارے ذریعہ کسی بندۂ مومن کا شکستہ دل مطمئن ہو جائے یا کم از کم مخالفت کی آگ نہ بھڑکنے پائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ تم میرے دوستوں کے احترام کا وعدہ کرو۔ میں تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ نہ کبھی قتل ہو گے، نہ کبھی گرفتار ہو گے اور نہ کبھی فاقہ کی نوبت آسکتی ہے۔

(سفینۃ البحار)

اِن رِوایتوں سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں :۔

(۱) امام کو غیب کا علم بھی رہتا ہے۔

(۲) دشمن کے خوف سے تقیہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳) تقیہ کے اعمال پیشِ پروردگار مقبول ہیں اور اسی لئے حضرت نے دوبارہ نمازوں کی قضا کا حکم نہیں دیا ہے۔

(۴) حکومت و اقتدار پا جانے کے بعد انسان کو کسی وقت بھی یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ بندۂ مومن کے احترام کو فراموش کر دے اور حکومت کے نشہ میں اس کو اپنے دروازہ سے واپس کر دے۔

(۵) باطل حکومت کی ملازمت اسی وقت تک جائز ہے جب تک اہلِ حق کی خدمت

ہوتی رہے یا ان کے فائدہ کی صورتیں نکلتی رہیں۔

۶ باطل حکومت کا دیا ہوا جائزہ و انعام قابلِ استعمال ہوتا ہے۔ کاش آج کی دنیا امام کے انھیں تعلیمات کو پیش نظر رکھتی اور ظالم حکومت کی خوشامد میں اہلِ حق کے حقوق کو پامال نہ کیا جاتا۔

۱۱۔ اسحاقؒ بن عمار کوفی ـــــ امام صادق، امام کاظمؑ کے شاگرد اور اہلِ رجال کے نزدیک معتبر ترین صحابی تھے۔

زمانہ قدیم کے علماء ان کو فطحی کہتے تھے یعنی عبداللہ افطح (پسر امام جعفر صادق) کی امامت کے قائل ـــــ لیکن شیخ بہائی کی تحقیق یہ ہے کہ وہ اسحٰق موسیٰ کے پوتے تھے اور یہ اسحٰق حیان کے پوتے ہیں جو شیعہ مسلک کے قائل تھے۔ علامۂ طباطبائی اور محدث نوری نے اس تحقیق کو بھی غلط ٹھہرایا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسحٰق صرف ایک صحابی کا نام تھا اور وہ شیعہ تھے فطحی نہ تھے۔

۱۲۔ برید بن معاویہ ـــــ ان کا شمار اصحابِ اجماع، اہلِ بہشت، نجباء اور امانتداروں میں ہوتا تھا۔

امام صادق فرماتے تھے کہ چار افراد دین کے پرچم اور زمین کے ستون ہیں۔

محمد بن مسلم، برید بن معاویہ، لیث بن بختری اور زرارہ بن اعین۔

۱۳۔ ابوحمزہ ثمالیؒ ـــــ آپ کا اسم شریف ثابت بن دینار تھا۔ چار اماموں کی خدمت میں شرفیاب ہوئے تھے۔ امام صادق نے آپ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ تمھیں دیکھ کر مجھے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

امام رضا نے فرمایا تھا کہ ابوحمزہ اپنے دور کے سلمان فارسی تھے۔

۱۴۔ حمرانؒ بن اعین ـــــ علمِ کلام کے ایک بہت بڑے ماہر مردِ شامی سے مناظرہ کی نوبت آئی تو امامؑ نے ان کو بحث کرنے کا حکم دیا اور انھوں نے اس انداز سے بحث کی کہ شامی نے ان کی مہارت کا اعتراف کر لیا۔

ایک مرتبہ ان کے بھائی بکیر، امام کی خدمت میں حج کے موقع پر حاضر ہوئے اور ان کا

سلام عرض کیا تو آپ نے جوابِ سلام دیتے ہوئے فرمایا کہ حمران اہلِ جنت میں سے ہیں جن ایمان متزلزل نہیں ہوسکتا ہے۔

۱۵۔ **لیثؒ بن نجتری** —— آپ کا شمار ان چار افراد میں ہوتا ہے جن کے متعلق امام جعفر صادقؑ کا ارشاد تھا کہ اگر یہ نہ ہوتے تو نبوت کے آثار اور حلال وحرام سب تباہ و برباد ہوجاتے۔

عام طور سے آپ ابوبصیر کے نام سے مشہور ہیں۔

۱۶۔ **محمدؒ بن مسلم** —— آپ کی جلالتِ قدر کا یہ عالم تھا کہ آپ نے تیس ہزار حدیثیں امام باقرؑ سے اور ۱۶ ہزار حدیثیں امام صادقؑ سے حاصل کی تھیں۔

ایک مرتبہ کافی رات گئے ایک عورت نے آپ کے دروازہ پر آکر یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت وضع حمل کے وقت مر گئی اور بچہ پیٹ میں زندہ ہے تو اس کے متعلق حکمِ شریعت کیا ہے؟

آپ نے پیٹ چاک کرکے بچہ کو نکال لینے کا حکم دے دیا۔ اور فرمایا کہ میں ایک گوشہ نشین آدمی ہوں، تجھے میرا پتہ کیسے معلوم ہوگیا؟

اس نے کہا کہ مجھے حضرت ابوحنیفہ نے بھیجا ہے اور واپسی پر جواب سے باخبر کرنے کا حکم دیا ہے۔

صبح کے وقت جب محمد بن مسلم وارد مسجد ہوئے تو دیکھا کہ ابوحنیفہ اپنے شاگردوں سے یہی مسئلہ اپنے نام سے بیان فرمارہے ہیں۔

انھوں نے ایک گوشہ سے کھنکار کر انھیں اپنے وجود کی اطلاع دیدی تو انھوں نے فرمایا کہ کیا چاہتے ہو، کیا میں اس دنیا میں زندہ نہ رہوں؟

۱۷۔ **یونس بن ظبیان** —— آپ کی طرف سے علماء رجال کے خیالات اچھے نہیں ہیں لیکن محدث نوریؒ نے اس روایت کو آپ کے اعتبار کے لئے کافی قرار دیا ہے کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو امام نے فرمایا کہ اللہ ان پر رحمت نازل کرے اور انھیں جنت میں جگہ دے۔ وہ احادیث کے امانتدار تھے۔

("اصحاب اجماع" ان حضرات کو کہتے ہیں جن تک سلسلۂ سند کے صحیح ہو جانے کے بعد روایت معتبر ہو جاتی ہے اور امام اور ان کے درمیان کے راویوں پر نظر نہیں کی جاتی ہے۔ جیسے جمیل بن دراج، عبداللہ بن مسکان، عبداللہ بن بکیر، حماد بن عیسیٰ، حماد بن عثمان ابان بن عثمان، زرارہ، معروف، برید، ابوبصیر فضیل بن یسار، محمد بن مسلم، یونس بن عبدالرحمان، صفوان بن یحییٰ، محمد بن ابی عمیر، عبداللہ بن مغیرہ، حسن بن محبوب، احمد بن محمد بن ابی نصر۔)

راویانِ حدیث اور اصحاب اجماع کے علاوہ کچھ ایسے افراد بھی ہیں جن کا شمار امامؑ کے خواص میں ہوتا ہے۔ جن میں سے معلیٰ بن خنیس، اسحٰق بن عمار وغیرہ کا ذکر ہو چکا ہے اور تین عظیم شخصیتیں اور باقی رہ گئی ہیں :۔

ہشام بن حکم، ہشام بن سالم اور مومن طاق۔

چونکہ ان حضرات کے حالات میں دلچسپ مناظرے اور ایمان افروز بیانات بھی ہیں اس لئے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان حضرات کا ذکر آئندہ کسی مقام پر کیا جائے گا۔

رہ گئے جناب مفضل، معاویہ بن عمار، یونس بن یعقوب جیسے بزرگ حضرات تو ان کے تذکرہ کے لئے تفصیلی کتابوں کی طرف رجوع کی جائے یا اس وقت تک کے لئے انتظار کیا جائے جب اس سلسلے کی دوسری کتاب منظرِ عام پر آسکے۔

**علمِ امامؑ**

امام جعفر صادقؑ کا وہ بے پناہ علم جس کی بنا پر بڑے بڑے بانیانِ مذہب آپ کی شاگردی پر ناز کیا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے ضرور انسان کو تعجب میں ڈال دیتا ہے کہ یہ علم اور یہ کمالِ معرفت ایک انسان کو کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے ؛ اور اسی حیرت کا نتیجہ تھا کہ شیخ ابوزہرہ نے آپ کے علم سے بحث کرتے ہوئے یہ طے کرنا شروع کر دیا کہ آپ کو بھی کسی نہ کسی بڑے امام کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ تاریخ اس خیال کی تائید سے مجبور تھی اس لئے علمِ امامت پر تبصرہ کرنے کے لئے دو راستے اختیار کئے گئے۔

کبھی یہ کہا گیا کہ وحی والہام نبوت کے خاصے ہیں اور امامت کے درجے کو نبوت سے

کمتر ہونا چاہئے۔ لہٰذا امام کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی ہے ورنہ امامت اور نبوت میں کوئی فرق ہی نہ رہے گا۔

کبھی یہ ذریعہ اختیار کیا گیا کہ اپنی زحمت سے حاصل کیا ہوا علم اس علم سے کہیں بہتر ہوتا ہے جسے الہامی کہا جاتا ہے اور جس میں کسی جدو جہد کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور چونکہ امام کی منزل عام انسانوں سے بلند تر ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کے علم میں جدو جہد کا دخل زیادہ ہونا چاہئے۔ ورنہ کوشش کرنے والوں کو اپنے امام پر تقدم حاصل ہو جائے

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں آپس میں متضاد ہونے کے علاوہ بالکل بے بنیاد نو مہمل ہیں۔

وحی والہام کا نبوت سے ایک مستحکم رشتہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ باتیں غیر نبی کو کسی عنوان سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی ہیں۔

قرآن مجید میں شہد کی مکھی، حضرت عیسیٰ کے اصحاب اور جناب موسیٰ کی والدہ کی طرف وحی کرنے کا صریحی ذکر موجود ہے چاہے وہ کسی معنی میں کیوں نہ ہو۔

فرق صرف یہ ہے کہ وہ وحی والہام کسی ایک مخصوص کام کے لئے تھا اور نبوت و امامت کا الہام حیات و کائنات کے علم سے متعلق ہوتا ہے۔

رہ گیا جفاکشی کے علم کا الہام سے بہتر ہونا۔ تو اس کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ اس طرح نبی کی منزل بھی ایک عام انسان سے پست تر ہو جائے گی کہ نبی کے لئے وحی والہام بہر حال مسلم ہے اور یہ معترض کی نظر میں قدر و قیمت کے اعتبار سے پست تر ہوتا ہے۔

کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ پروردگار عالم اپنے نبی کو پوری کائنات کا علم دے اور کلمہ گو اس کی توہین کرے۔ وہ ائمہ ہدیٰ کو اس کتاب کا وارث قرار دے جو خشک و تر کا مجموعہ ہو اور قرآن پر ایمان لانے والی امت ان کے علم میں شبہ کرے۔

درحقیقت ان لوگوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ نبی و امام کو بھی عام علماء کی طرح سند اجتہاد پر بٹھلا کر ان کے لئے بھی غلطیوں کو روا کر دیں۔

امام صادق کے لئے استادوں کا فرض کرنا بھی ابو زہرہ کی نظر میں ضروری تھا۔ اس لئے

انھوں نے حضرت کے لئے تین استاد تلاش کر لئے اور فرمایا کہ اتنے بے پناہ علم کے لئے متعدد اساتذہ کی ضرورت تھی لیکن تاریخ نے ان تین افراد کے علاوہ کسی اور کا نام نہیں بتایا ہے۔

۱۔ امام زین العابدینؑ جو زید بن اسلم اور سعید بن جبیر کے شاگرد تھے۔

۲۔ امام محمد باقرؑ

۳۔ قاسم بن محمد بن ابی بکر

افسوس کہ ابو زہرہ نے اس سلسلہ میں کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا ہے جس پر کوئی تبصرہ کیا جاتا۔ صرف کتاب بدایہ و نہایہ کا ذکر کیا ہے جس میں یہ بات نظر نہیں آتی ہے بلکہ زید ابن اسلم اور سعید کے بارے مختلف علماء رجال نے یہ نقل کیا ہے کہ یہ خود امام زین العابدین سے روایتیں لیا کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب)

یہی حال قاسم کا بھی ہے کہ ان کا شمار امام زین العابدین اور امام باقرؑ کے اصحاب میں ہوتا ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ امام زین العابدین ان حضرات کے استاد تھے نہ کہ شاگرد۔ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ زید و سعید و قاسم جیسے افراد کو امام کا استاد قرار دیا جا رہا ہے جن کے علم کا کوئی شہرہ یا جن کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اور حضرت ابو حنیفہ جنھیں حضرت خضرؑ پیغمبر کا استاد کہا جاتا ہے اور ایک مستقل مذہب کا بانی مانا جاتا ہے وہ خود امام جعفر صادقؑ کو پوری کائنات میں سب سے بہتر عالم قرار دیتے ہیں اور ان کی نظر میں اصحاب پیغمبرؐ میں بھی حضرت سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا۔

امام جعفر صادقؑ کی منزل تو بہت بلند ہے۔ حضرت ابو حنیفہ نے تو آپ کے چاہنے والوں اور شیعوں سے بھی شاگردی کا شرف حاصل کیا ہے اور ان سے بھی روایتیں نقل کی ہیں۔ جیسے:-

جابر بن یزید متوفی ۱۲۵ھ

حبیب ابن ابی ثابت متوفی ۱۱۹ھ

مخول ابن راشد متوفی ۱۴۱ھ

عطیہ بن سعد متوفی ۱۱۱ھ

سلمٰی ابن کہیل متوفی ۱۱۳ھ
اجلح کندی ۱۴۵ھ
اسمٰعیل بن عبد الرحمٰن متوفی ۱۱۳ھ
منہال بن عمر کوفی
عدی بن ثابت متوفی ۱۱۶ھ
زید بن حارث متوفی ۱۲۲ھ

(کتاب الخراج، کتاب الرد علی الاوزاعی)

یہیں سے ابو عصمت کے اس بیان کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے جس میں شیعہ اصحاب سے روایت کرنے کو ابو حنیفہ کی نظر میں ناجائز قرار دیا ہے کہ جو شخص خود ہی شیعوں سے روایت کرتا ہے اس کی زبان سے ایسا فتویٰ کیوں کر صادر ہو سکتا ہے۔

ابو عصمت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ علمار رجال کی نظر میں ایک انتہائی فتنہ گر اور مفسدہ پرداز آدمی تھے۔

حافظ زین الدین عراقی نے اسے جعلساز اور بخاری و ابن حجر نے اسے جھوٹا، مجوسی، بے ایمان اور مفسد قرار دیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اس نکتہ کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ آپ کی عظمت کا اعتراف ان حضرات نے بھی کیا ہے جو آپ کے معاصر اور اعترافِ فضیلت میں انتہائی متعصب یا محتاط تھے۔

آپ کے دور میں مذہبی نوک جھونک اور معاصرانہ چشمک شباب پر تھی۔ کوئی شخص کسی کی عظمت کا اعتراف کرنا اپنے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھتا تھا۔ حد یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ جیسے بزرگ شخص کے لئے مالک، شافعی، اوزاعی، حسن بن صالح، سفیان ثوری اور احمد بن حنبل جیسے تمام بزرگ ضلالت اور گمراہی کا فتویٰ دے رہے تھے جیسا کہ ابو بکر سجستانی نے اپنے اصحاب سے بیان کیا تھا۔ (تاریخ خطیب ۱۳ ص ۳۸۴)

مالک بن انس کے ذکر کو نامناسب خیال کیا جاتا تھا۔ (مختصر جامع بیان العلم وفضلہ)

ابراہیم بن سعد ان کے بارے میں بدگوئی کرتے تھے۔
ابراہیم بن یحییٰ ان کے لئے بددعا کرتے تھے۔
محمد بن اسحٰق ان کے شجرۂ نسب پر حملے کرتے تھے۔ (تاریخ خطیب ۱ص۲۲۳)
امام شافعی کو ابن معین غیر معتبر قرار دیتے تھے۔
علامہ زمخشری آخر تک یہی کہتے رہے کہ میں اپنے مذہب کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔
حنفی کہتا ہوں تو شراب کو جائز کر دینے کا الزام آتا ہے۔
مالکی کہتا ہوں تو کتے کے گوشت کو حلال کرنا پڑتا ہے۔
شافعی کہتا ہوں تو لڑکی سے نکاح کرنا پڑتا ہے۔
حنبلی کہتا ہوں تو خدا کو مجسم ماننا پڑتا ہے۔ (حالات زمخشری در کشاف)

ایسے سخت حالات میں امام صادقؑ کو وارثِ کتاب، اعلم عصر، فقیہ وقت، حلال مشکلات، نبّاض امت، معلم اسلام جیسے گراں قدر القاب سے یاد کیا جانا اگر معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کا مسلک تو چاروں مذاہب سے الگ صرف قرآن و سنت کی بنیادوں پر پروان چڑھ رہا تھا۔ آپ کے ساتھ نہ مسند قضاوت و فتویٰ کی طاقت تھی اور نہ کرسی حکومت و سلطنت کی ہمراہی۔

مگر افسوس! کہ اتنی عظمت و اہمیت کے ہوتے ہوئے بھی امام بخاری نے آپ کو اس قابل نہ سمجھا کہ عکرمہ خارجی، مغیرہ، عمران بن حطان (مداح ابن ملجم) وغیرہ جیسے راویوں کی حدیثیں نقل کرتے ہوئے ایک آدھ روایت آپ سے بھی نقل کر دیتے ——

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

—— جوادی

# صبحِ غم

## (۱)

مقدر نے بنی امیہ کو ایک نادر موقع اس وقت عطا کیا جب حضرت عثمان[1] امت کے رئیس، قوم کے قائد اور رسول اکرمؐ کے خلیفہ کی حیثیت سے منتخب ہو گئے اور بنو امیہ کو مایوسی کی ظلمتوں میں امید کی کرن دکھائی دینے لگی۔ راحت کی نسیم ان کے دل و دماغ تک پہنچی اور اس رات کی صبح نمودار ہونے لگی جسے بڑے انتظار و اضطراب کے عالم میں گذارا گیا تھا۔

بنی امیہ اپنی شکست خوردہ پارٹی اور مٹی ہوئی حیثیت کو پلٹانے سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن مقدر جو صبح و شام نیرنگیاں دکھلایا کرتا ہے اور جس کا کام لوگوں کا امتحان اور ان کی آزمائش ہے اس نے پھر پلٹا کھایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوبارہ امت کے امیر بن کر اس کی قسمت سے کھیلنے لگے۔

دورِ عثمان وہ دور ہے جب مروان بن الحکم[2] حکومت کا امین عام اور خلیفہ کا وزیرِ خاص

---

[1] عثمان بن عفان بن العاص بن امیہ بن عبد شمس۔ ماں کا نام اروی بنت کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبد شمس تھا۔ ۲۳-۲۴ھ میں بیعت ہوئی۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ روز جمعہ قتل ہوئے۔ ۲۲ دن اپنے گھر میں محصور رہے۔ یہودیوں کے مقبرہ حش کوکب میں دفن ہوئے۔ آپ کی عمر ۶۳۔ ۶۸۔ ۷۵۔ ۸۸ یا ۹۰ سال تھی۔

(طبری ج ۲۔ حوادث ۳۵ھ)

[2] مروان بن الحکم بن العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف روز جنگِ احد یا خندق (باقی اگلے صفحہ پر)

بن چکا ہے۔ اموال کو جمع کرتا ہے۔ غنیمت کا خمس وصول کرتا ہے۔ تنگ دستی و خستہ حالی کے بدلے امت کے اموال سے رنگ رلیاں کرتا ہے۔

وہ غلام جو کل امت کی تباہی کا باعث تھے آج رئیس وقت بن کر حکومت کو گیند کی طرح نچا رہے ہیں۔ منبر رسول پر بندروں[۱] کی طرح رقص ہو رہا ہے۔

حضرت عثمان کا انتخاب اس انداز سے عمل میں آیا کہ اس میں نہ کسی کارِ نمایاں کا تذکرہ ہوا، نہ صاحبِ رسالتؐ سے کسی قرابت کا اور نہ خلیفہ کو حضرت علیؑ سے کسی اعتبار سے اولویت ہی حاصل تھی۔ لہٰذا یہ ہوا کہ اصحابِ پیغمبرؐ نے خلیفہ کا بائیکاٹ کر دیا اور بنی امیہ کے مظالم کے زیر اثر ایک ایسا انقلاب رونما ہوا جس کے حدود حضرت عثمان کے قتل اور حضرت علیؑ کی بیعت تک کھنچ گئے۔

(۲)

حضرت عثمان کے قتل اور حضرت علیؑ کی بیعت کے بعد معاویہ[۲] نے اپنے کو اس کشمکش میں پایا کہ یا تو حضرت علیؑ سے جنگ کا اعلان کر دے جب کہ وہ مکمل طریقہ پر خلیفۂ رسولؐ تسلیم

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پیدا ہوا۔ ابن عبد البر کی رائے میں حضورؐ نے اسے بچپن ہی میں مدینہ سے باہر نکال دیا تھا لہٰذا یہ صحابی نہیں ہے۔ ۶۴ھ میں خلیفہ ہوا اور ۶۵ھ میں اس کی زوجہ ام خالد بن یزید نے قتل کر دیا۔ حکم بن العاص کو رسول اکرمؐ نے مدینہ سے نکال دیا تھا۔ عثمان نے واپس بلا لیا۔ آنحضرتؐ نے بارہا اس پر لعنت کی ہے جیسا کہ حضرت عائشہ نے مروان سے کہا تھا۔ (اصابہ ج ۱ ص ۳۴۶)

[۱] بنی امیہ کے منبر پر اچکنے کا خواب حضور اکرمؐ نے دیکھا تھا اور قرآن کریم نے اس پر آپ کو تسلی دی تھی۔ جو واقعات متواتر طریقہ پر نقل کئے گئے ہیں۔ (تفسیر ابن جریر۔ تفسیر درمنثور)

[۲] معاویہ ابن ابی سفیان بن صخر بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔ بعثت سے ۵ یا ۷ سال قبل متولد ہوا۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا۔ رجب ۶۰ھ میں دنیا سے چل بسا۔ اس کا شمار مولفۃ القلوب میں ہوتا تھا۔ اس کا دین مخدوش تھا۔ زمخشری نے ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ معاویہ کو حضرت عمر نے حاکم بنایا تھا۔ انھوں نے اپنے تمام عمال سے مواخذہ کیا لیکن معاویہ کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ معاویہ بیس سال تک حکومت کرتا رہا۔

کئے جا چکے ہیں یا اسلام میں داخلہ کی طرح ان کی بیعت میں بھی بادلِ ناخواستہ داخل ہو جائے۔
معاویہ حضرت علیؑ کی شخصیت اور ان کی حیثیت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ وہ اپنی فطری عدالت کے استعمال میں کسی شخص کا لحاظ نہیں کرتے ہیں اور ان کے دورِ حکومت تک کسی مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اس کی طبعی شرارت اور حضرت علیؑ کی فطری عدالت کا تضاد بالکل واضح تھا۔
سوال صرف یہ تھا کہ ـــــ اگر علیؑ کی سلطنت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور انھیں شوکت و حشمت حاصل ہو گئی تو معاویہ کا موقف کیا ہوگا؟ ابھی تو موجودہ حالات کا نتیجہ کبھی سامنے نہیں آیا۔ اسی کشمکش میں قریب تھا کہ معاویہ مقابلہ کے میدان سے الگ ہو جائے کہ وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف تھا کہ میرے پاس نہ تو علیؑ سے جنگ کرنے کے آلات و اسباب ہیں اور نہ امت پر حکومت کرنے کی استعداد ہے۔
وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ہند اور ابوسفیان کا لختِ جگر ہے جنھوں نے ہر میدان میں مشرکین کی نمائندگی کی ہے اور اسلام میں ان کے خدمات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔
معاویہ میدانِ مقابلہ سے ہٹ کر حضرت علیؑ کی بیعت میں داخل ہو جاتا لیکن ام المومنین عائشہ کے ذوقِ انتقام اور طلحہ و زبیر کی بیعت شکنی نے اس کے لئے مقابلہ کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا۔
چنانچہ اس نے فوری طور پر زبیر کو یہ خط لکھ دیا کہ "میں نے پہلے تمھاری اور تمھارے بعد طلحہ کی بیعت کر لی ہے لہذا عراق ہاتھ سے جانے نہ پائے۔"
ظاہر ہے کہ اس بیعت کا مقصد صرف یہ تھا کہ معاویہ اپنے کو حضرت علیؑ کی بیعت سے الگ کر لے کہ وہ حضرت علیؑ کے ساتھ زندگی گذارنے پر قادر نہ تھا اور یہ بیعت ایسی تھی جس سے معاویہ ان تمام مشکلات سے نجات پا سکتا تھا جو اس کے ذہن کو الجھائے ہوئے تھیں۔
عجب نہیں کہ معاویہ کے ذہن میں یہ بات رہی ہو اور وہ اس امر کی طرف متوجہ رہا ہو کہ علی کے مقابلہ میں سب سے زیادہ خطرناک اور کارگر اسلحہ یہی ہے کہ ان سے خونِ عثمان کا مطالبہ کر دیا جائے، یہ اور بات ہے کہ عثمان کی اولاد کے ہوتے ہوئے اسے خون کے مطالبہ کا

کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔

لیکن وہ اس اسلحہ کے استعمال میں متردد تھا اور اسی کشمکش و اضطراب کے ساتھ اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب اسے استعمال کر کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکے لیکن خود معاویہ میں اس کے استعمال کی طاقت نہ تھی جب تک کہ ام المومنین عائشہ اسے سہارا نہ دے دیں۔

چنانچہ حضرت عائشہ کا اقدام ہی تھا جس نے حضرت علیؑ کی مخالفت اور ان سے قتلِ عثمان کے قصاص کی جرأت پیدا کرائی ہے اور واقعی قتل کرنے والوں کے "واعثماناہ" کے نعروں نے شام کی فضا میں ایک ہیجان برپا کر کے شامیوں کے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔

(۳)

معاویہ نے اپنے لئے قصاص کا حق فرض کر لیا۔ وہ اپنے طور پر حضرت عثمان کا جائز وارث بن گیا لیکن پھر بھی اس کشمکش کا شکار رہا کہ اس خون کا مطالبہ کس سے کیا جائے جب کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس قتل میں شریک ہے۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ اس قتل کا پورا بار حضرت علیؑ کے سر ڈال کر رائے عامہ کو ان کے خلاف کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے تمام اصحابِ رسولؐ کی مخالفت کو نظر انداز کر دیا اور یہ نہیں دیکھا کہ عثمان کی اموّیت پرستی، صحابہ سے بے اعتنائی، کنبہ پروری اور مروان دوستی کی بنا پر تمام اصحاب نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور حد یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف جس نے کل خلافت دلوائی تھی وہ بھی یہ وصیّت کر رہا تھا کہ حضرت عثمان اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں۔ اور طلحہ کھلم کھلا مخالفت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان نے ان کے لئے بددعا کی تھی "خدایا طلحہ کے شر سے محفوظ رکھنا، اس نے لوگوں کو میرے خلاف آمادہ کیا ہے۔ خدا کی قسم میری تمنا یہ ہے کہ اسے کوئی فائدہ نہ ہو بلکہ اس کا خون بہایا جائے۔"

(کامل ج ۳ ص ۸۶)

حضرت عائشہ کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ موئے مبارک، لباسِ رسولؐ، کفشِ پیغمبرؐ تمام تبرکات کو نکال کر فریاد کر رہی تھیں "ابھی تو یہ تبرکات بوسیدہ و کہنہ بھی نہیں ہوئے اور تم لوگوں نے سنّتِ رسولؐ کو ترک کر دیا۔" (بلاذری ۵ ص ۴۸)

حضرت عثمان نے اس اقدام کے خلاف سخت و سست کہا تو یہ جواب ملا کہ "عثمان نے حدودِ خدا کو معطل کر دیا ہے۔ وہ گواہوں پر سختی کرتا ہے۔"
انھوں نے کہا کہ "آپ عورت ہیں، آپ کا فریضہ گھر میں بیٹھنا ہے، آپ کو ان معاملات سے کیا تعلق ہے؟" ایک جماعت نے ان کا ساتھ بھی دیا لیکن بعض نے یہ آواز بلند کر دی کہ ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپس ہی میں مخالفت ہو گئی جو سرکارِ دو عالمؐ کے بعد مسلمانوں کا آپس کا پہلا جھگڑا تھا۔ (بلاذری ۵ ص۸۴)
معاویہ کا وزیرِ خاص یعنی عمرو عاص بھی حضرت عثمان کے نمایاں مخالفین میں سے تھا۔ اور انھیں توبہ کرنے کا حکم دیا کرتا تھا۔ (طبری ۳ ص۳۶۹)
ایک مرتبہ اس نے حضرت عثمان سے کہہ دیا کہ "خدا سے ڈرو۔"
تو انھوں نے جواب دیا کہ: "اے زنِ زانیہ کے فرزند یہ تمام باتیں میرے معزول کر دینے کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔"
ایک آواز پھر بلند ہوئی "توبہ کرو۔" (کامل ۳ ص۸۰) یہ دیکھ کر وہ فلسطین بھاگ گیا اور وہاں کے لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف ابھارنے لگا۔ اور جب قتلِ عثمان کی خبر ملی تو اسے بھی اپنے ہی کارناموں میں شمار کر لیا۔ (بلاذری ۵ ص۷۴)
مختصر یہ کہ حضرت عثمان کی خاندان پرستی کی بنا پر صحابہ کی اکثریت ان کے خلاف تھی۔ مصری لشکر کے قائد عبدالرحمٰن بن عدیس بلوی بھی صحابیٔ رسول اور اصحاب بیعت شجرہ میں سے تھے۔ محاصرہ کرنے والے رفاعہ بن رافع انصاری، نیار بن عیاض جیسے حضرات بھی اصحابِ رسولؐ میں تھے۔
اہلِ مدینہ نے مختلف شہروں میں یہ خطوط لکھ دیئے تھے کہ اگر جہاد کرنا چاہتے ہو تو مدینہ آؤ۔ یہاں خلیفۂ وقت نے دینِ خدا کو تباہ کر دیا ہے۔ (کامل ۳ ص۸۳۔ بلاذری ۵ ص۶۰۔ طبری ۳ ص۴۰۰)
معاویہ نے ان تمام حالات کو نظر انداز کر کے حضرت علیؑ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس کے دل میں حضرت علیؑ کی طرف سے کسی مروّت کی گنجائش نہ تھی۔ وہ حضرت علیؑ

کے عدل و ایمان کا مخالف تھا اور آپ کبھی اس کے ظلم و نفاق کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے اقدام کو کامیاب بنانے کے لئے مکر و فریب کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ کمزور دماغ، سادہ لوح عوام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی کہ علیؑ عثمان کے قاتل ہیں۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ عثمان کی قمیص رکھ کر اس کے گرد جمع ہو کر نوحہ و ماتم کرنے لگے۔

ادھر اس نے قبیصہ عبسی کو اپنا نمائندہ بنا کر مدینہ بھیجا۔ حضرت علیؑ نے اس سے پوچھا کہ شام کا کیا عالم ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ قوم سوائے قصاص کے کسی اور سمجھوتہ پر تیار نہیں ہے۔

آپ نے پوچھا یہ قصاص کس سے لیا جائے گا؟

اس نے جواب دیا کہ آپ کی گردن سے۔ میں نے وہاں یہ منظر دیکھا ہے کہ ساٹھ ہزار شیوخ قمیصِ عثمان کے گرد جمع ہو کر گریہ و شیون کر رہے ہیں اور وہ قمیص منبرِ دمشق پر آویزاں کر دی گئی ہے۔

آپ نے حیرت زدہ انداز سے فرمایا "مجھ سے خونِ عثمان کے طالب ہیں؟

اس مقام پر سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاویہ کے دل میں حضرت عثمان کی طرف سے یہ رحم و کرم کے جذبات کیوں کر پیدا ہو گئے جب کہ کل تک تو ان کی فریاد پر یہ رگِ حمیت نہ پھڑک سکی تھی جیسا کہ طبری (۳ ص۴۰۲) نے لکھا ہے کہ عثمان نے معاویہ کے نام شام کی طرف ایک خط روانہ کیا۔ جس کا مضمون یہ تھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اما بعد۔ اہلِ مدینہ کافر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے میری بیعت توڑ کر میری اطاعت سے انکار کر دیا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے شام کے مجاہدین کو روانہ کر دو۔"

معاویہ کو جب یہ خط ملا تو چپ ہو کر بیٹھ رہا۔ اس کی نظر میں اصحابِ رسولؐ کی مخالفت مناسب نہ تھی۔ لہذا وہ کیوں کر نصرت کرتا۔ اس کا تو مقصد یہ تھا کہ مسلمان حضرت عثمان کا خاتمہ کر دیں تاکہ اسی بہانے اس منصوبہ پر عمل درآمد کیا جا سکے جو مدتوں سے دماغ میں گونج رہا ہے۔

ادھر بنی امیہ بھی اسی تاک میں بیٹھے تھے۔ ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ حضرت عثمان معزول نہ ہونے پائیں بلکہ قتل ہو جائیں کہ معزولی میں ان کی ساکھ بگڑ جائے گی اور بنی ہاشم سے انتقام کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہ آسکے گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مروان برابر شرارتیں کرتا رہا اور جب بھی امیر المومنینؑ نے حضرت عثمان اور مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تو یہ شخص آڑے آگیا اور اس مہم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ بلکہ ان چنگاریوں کو اور بھی ہوا دیتا رہا تاکہ حالات بد سے بدتر ہو جائیں اور اپنا مقصد حاصل ہو جائے۔

حضرت عثمان کو معاویہ سے بڑی امیدیں تھیں لیکن معاویہ نے بڑی بے باکی کے ساتھ انھیں مایوس و محروم بنا دیا۔

انقلابی جماعت کی سختیاں اور بڑھیں تو حضرت عثمان نے دوبارہ معاویہ کو لکھا اور اس مرتبہ اس نے یزید قسری کی قیادت میں ایک لشکر روانہ بھی کر دیا لیکن یہ ہدایت کر دی کہ یہ لوگ مقام ذی خشب سے آگے نہ بڑھیں اس لئے کہ میں اس انجام کو دیکھ رہا ہوں جسے تم نہیں دیکھ رہے ہو۔

چنانچہ یہ لشکر اسی مقام پر ٹھہرا رہا اور جب حضرت عثمان کا قتل واقع ہو گیا تو معاویہ نے اسے شام کی طرف واپس بلا لیا جس کی طرف حضرت ابو ایوب انصاری نے معاویہ سے گفتگو کے درمیان اشارہ بھی کیا تھا کہ "وہ شخص جس نے حضرت عثمان کی موت کا انتظار کیا اور یزید بن اسید کو ان کی نصرت نہ کرنے دی وہ تم ہی ہو۔

معاویہ کا مقصد اس قصاص سے بالکل واضح تھا۔ اس کے لشکر میں خود ہی ایسے افراد موجود تھے جو قتل عثمان میں شریک رہ چکے تھے اور معاویہ کو ان کا علم بھی تھا لیکن اس کا کام تو صرف یہ تھا کہ اموی سانچہ میں ڈھلی ہوئی رعایا کو اپنی حمایت پر آمادہ کر کے ان میں حضرت عثمان کی ہمدردی کا شعور پیدا کرائے تاکہ یہی جذبہ ایک دن اپنے مقصد کی کامیابی کی تمہید بن سکے۔

معاویہ اپنے مکر و فریب کی بنا پر اس قدر ضرور کامیاب ہو گیا کہ وہ حضرت علیؑ کا مقابل

تصور ہونے لگا اور کمزور عقل والوں نے اسے اپنا امام تسلیم کر کے حضرت علیؑ کے خلاف جا بجا یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ خلیفۃ المسلمین کو حضرت علیؑ نے قتل کیا ہے۔

عوام کے اس نمائشی سوگ اور مقدس نما بے دین مسلمانوں کی تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ اسلامی معاشرہ میں حضرت علیؑ کے قاتل ہونے کی داستان زہر کی طرح سرایت کر گئی اور ہر شخص فطری طور پر خلیفہ کا قصاص لینے پر آمادہ ہو گیا۔ معاویہ کو صرف اس بات کی ضرورت رہ گئی تھی کہ وہ عوام کے اس شعور کو بیدار رکھے اور ان کے ان جذبات کو ہوا دیتا رہے۔ چنانچہ اس کی مکاریوں سے تمام لوگوں نے اس بات کا عہد کر لیا کہ جب تک قاتلین عثمان سے انتقام نہ لے لیں گے۔ اس وقت تک علاوہ غسل جنابت کے کسی بھی کام کے لئے پانی کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔

ادھر عمرو عاص اپنے دونوں لڑکوں کو لئے ہوئے روتا پیٹتا پیدل دمشق پہنچ گیا اور حضرت علیؑ کی عداوت میں معاویہ کے ہاتھ پر انتقامِ قتلِ عثمان کی بیعت کر لی اور اس سے یہ بھی طے کر لیا کہ اس خدمت کے صلہ میں تا حیات مصر کا والی رہے گا۔ (کامل ۳ صـ۱۲۹)

معاویہ نے برضا و رغبت اس شرط کو قبول کر لیا کہ اس کا مقصد اس قسم کے افراد کو آلۂ کار بنا کر حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کرنا اور ان کی حکومت کو ناکام بنانا تھا۔

آخر کار یہ مہم کامیاب ہوئی اور اب خونِ عثمان حضرت علیؑ کی گردن پر طے ہو گیا۔

(۴)

ادھر ام المومنین حضرت عائشہ جو حضرت عثمان کو محاصرہ میں چھوڑ گئی تھیں۔ مکہ میں بیٹھی ہوئی مدینہ کی خبروں کا انتظار کر رہی تھیں کہ ایک شخص اخضر نامی وارد ہوا۔ آپ نے اس سے حالات معلوم کئے۔ اس نے بتایا کہ حضرت عثمان نے اہل مصر کو قتل کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ وہ قوم جو اپنا حق لینے آئی تھی اور ظلم کی مخالف تھی اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ خدا کی قسم میں اس حرکت سے راضی نہیں ہوں۔"

گفتگو کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ آپ کی ہمدردیاں مصر والوں کے ساتھ تھیں اور آپ حضرت عثمان کی شدید مخالف تھیں لیکن اسی دوران میں ایک دوسرا شخص پہنچ گیا۔ آپ نے

اس سے بھی حالات دریافت کئے۔ اس نے بتایا کہ اہلِ مصر نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ حیرت ہے کہ اس اخضر نے قاتل کو مقتول اور مقتول کو قاتل سمجھ لیا۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں اور مدینہ کے لئے روانہ ہو گئیں۔ اثناء راہ میں یہ خبر ملی کہ قتل عثمان کے بعد حضرت علیؑ کی بیعت ہو گئی ہے تو گھبرا کر اعلان کر دیا۔ ارے، مجھے واپس کرو۔ عثمان مظلوم مارے گئے۔ تم لوگ ان کے خون کا مطالبہ کرو۔ (طبری ۳ صـ۴۶۹۔ کامل ۳ صـ۱۰۲)

اے کاش یہ آسمان زمین پر گر پڑتا۔ ارے مجھے واپس کرو۔ میں عثمان کے خون کا انتقام لوں گی۔ وہ مظلوم مارے گئے۔

ایک شخص نے عرض کیا" بی بی سب سے پہلے تو آپ ہی نے ان کی مخالفت کی تھی۔ اور یہ فرمایا تھا کہ یہ نعثل ہے، یہ کافر ہے، یہ واجب القتل ہے"

فرمایا ٹھیک ہے، لیکن دوسری بات پہلی بات سے بہتر ہوتی ہے۔

اس نے فی البدیہ کچھ شعر پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا" یہ سارا کیا دھرا تو آپ ہی کا ہے۔ آپ ہی نے کفر کا فتویٰ دیا تھا اور آپ ہی نے قتل کا حکم صادر کیا تھا"

بنی امیہ آپ کے ساتھ ہو گئے۔ طلحہ و زبیر نے آپ کی ہمراہی کی اور اس طرح بصرہ کے لئے لشکر تیار ہو گیا۔ چاروں طرف حضرت عثمان کے قتل اور حضرت علیؑ سے انتقام لینے کا چرچا ہونے لگا۔

جس کے نتیجہ میں جمل، صفین، قضیۂ تحکیم جیسے حادثات رونما ہوئے اور حضرت علیؑ اپنی عدالت پسند زندگی اور سیرتِ رسولؐ کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی رفتار کی بنا پر شہید کر دیئے گئے۔

آپ کے بعد امام حسنؑ منصوص من اللہ امام ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کی بھی بیعت کر لی لیکن معاویہ نے پھر اعلانِ جنگ کر دیا۔ مختلف حیلوں سے آپ کی حکومت کو ناکام بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

امام حسنؑ نے ان حالات کا مقابلہ شروع کیا اور نہایت ہی حسن تدبیر کے ساتھ صلح کرنے پر تیار ہو گئے تاکہ معاویہ اپنی مطلق العنان حکومت کے زعم میں مظالم کو اسی حد پر روک دے ورنہ میدانِ مقابلہ میں کامیاب ہونے کے بعد وہ ہر ایسا حربہ استعمال کر سکتا ہے جسے

پست طبیعت، ذلیل فطرت اور بے دین افراد استعمال کیا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنے شرائط کو معاویہ کی راہوں میں حائل کر دیا جس کی بنا پر معاویہ اس کشمکش میں مبتلا ہو گیا کہ ایک طرف تو امام حسنؑ نے صلح کی ہے لہذا ان سے انتقام نہیں لیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف صلح میں شرائط طے پا گئے ہیں جن کی مخالفت نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس لئے اس نے درپردہ آپ کے خاتمہ کی کوشش شروع کر دی اور آخر کار ایک دن زہرِ دغا سے شہید کرا دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔۔۔۔ (اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ)

(۵)

معاویہ نے کسی دن بھی اس عظیم سلطنت اور مقدس خلافت کا خواب نہ دیکھا ہوگا جس کے تخت پر آج متمکن ہے۔ وہ کل تک اقتصادی اعتبار سے فقیر، قومی لحاظ سے ذلیل اور ایک آزاد کردہ غلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر اپنے باپ کے ساتھ اسلام میں داخل ہو گیا تھا لیکن سینہ کفر کے ان تمام جراثیم سے بھرا ہوا تھا جو ابوسفیان کے فرزند کے دل میں ہونے چاہئیں۔

معاویہ کا اس انداز سے حضرت علیؑ سے مقابلہ کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ وہ ابوسفیان سے بنی ہاشم کی عداوت وراثت میں پا چکا تھا۔ بنی ہاشم کی دشمنی اس کے رگ و پے میں سرایت کر کے اس کے وجود کا جز بن گئی تھی۔

وہ دور مسلمانوں کے لئے کتنا سخت ہوگا جس میں ایسے اسلام دشمن افراد تختِ حکومت کے مالک ہو جائیں جن کے دل حسد و بغض، ظلم و انتقام کے جذبات سے بھرے ہوں اور جنھوں نے اپنی زندگی میں عدل و انصاف، شفقت و رحمت کا نام بھی نہ سنا ہو۔

معاویہ اسے بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی شخص حضرت علیؑ کا ذکرِ خیر کر سکے یا صفحۂ وجود پر ان کے چاہنے والے کہیں نظر آ سکیں۔ اس نے تمام عمال کو یہ حکم دے دیا تھا کہ جس کے بارے میں محبتِ علیؑ ثابت ہو جائے اس کا نام رجسٹر سے کاٹ کر اس کا عطیہ بند کر دیا جائے کہ علیؑ کی دشمنی لوگوں کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو جائے کہ اس کا سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہے۔

مدائنی نے کتاب الاحداث میں نقل کیا ہے کہ معاویہ نے اپنے تمام عمال کو یہ اطلاع بھیج دی کہ جو شخص ابوتراب کے فضائل میں کوئی روایت بیان کرے میں اس کے خون کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

اب خطیبوں کا شعار یہ ہوگیا کہ حضرت علیؑ کی مذمت و منقصت کریں۔ ان کے خلاف مواد جمع کریں۔ اور مصیبت اہلِ کوفہ کے لئے تھی کہ ان کے سر پر مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن سمیہ جیسے لوگوں کو حاکم بنا دیا گیا تھا۔ زیاد کوفہ کے ساتھ بصرہ کا بھی حاکم تھا۔ اب محبتِ علیؑ میں ہاتھ پیر کاٹے جا رہے تھے، گھر گرائے جا رہے تھے اور موت کا جام پلایا جا رہا تھا۔

معاویہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی موجودہ پالیسی کامیاب نہیں ہوسکتی ہے اس لئے کہ تشدد کے اثرات تشدد کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک دوسری پالیسی اختیار کی کہ حضرت علیؑ کے دشمنوں کو مقرب بارگاہ بنایا جائے۔ شیعیانِ عثمان کو انعامات دیئے جائیں۔ ان کا خاص خیال رکھا جائے۔ ان کے نام معتبر افراد کی فہرست میں درج کئے جائیں تاکہ حق نمک کے ذریعہ پوری فضا کو ہموار کر لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ تلوار کی دھار، قید خانہ کی تاریکی، قبر کی تنگی اور دربدری کی مصیبت سے ڈر جانے والے افراد خود بخود اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ اپنا نام دشمنانِ علیؑ کی فہرست میں درج کرا دیں اور حکومت سے انعام کے مستحق ہو جائیں۔

معاویہ اس کے بعد بھی نئی نئی فکروں سے غافل نہیں رہا اور اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے مسلسل سوچتا رہا اور آخرکار ایک کارگر طریقہ نکال لیا اور ضمیر فروش تجارت پیشہ لوگوں کو اس بات پر مامور کر دیا کہ وہ سرکار دو عالمؐ کی طرف منسوب کر کے روایتیں وضع کریں اور انعامات حاصل کریں۔ وہ اپنے اس طرز عمل پر نہ خدائی مواخذہ سے ڈرتا تھا اور نہ سماجی عتاب سے۔ اس نے اپنے مدعا کو حاصل کرنے کے لئے قتلِ مسلمین، غصبِ اموال، ہتک حرمت، گرفتاری و آبرو ریزی، تباہی و بربادی، توہینِ مساجد، عتابِ ناکردہ گناہ جیسے تمام طریقوں کے استعمال کو جائز کر لیا تھا اور کسی موقع پر کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

اس کے زمانے کے ان تمام حالات کو معتبر ترین مورخین نے اپنی تاریخوں میں درج کر دیا

ہے۔ اس لئے مجھے ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قصّہ مختصر یہ ہے کہ معاویہ اپنے جرائم کا بوجھ اپنی گردن پر لے کر راہیٔ عدم تو ہوگیا لیکن اپنی فطری شرارت کی بنا پر مسلمانوں کی گردن پر اپنے فاسق و فاجر بیٹے کو حاکم بنا گیا۔ اور یہ امّت کی بدقسمتی کی آخری منزل تھی کہ اس کے سر پر یزید جیسا بدکردار دشمنِ خدا و رسولؐ انسان مسلط ہو جائے معاویہ کے لئے یہ بات بھی کوئی نئی نہیں تھی۔ اس کے دل میں اسلام دشمنی کے چھپے ہوئے جذبات اسے بار بار اس بات پر ابھار رہے تھے کہ وہ حکومت کی باگ ڈور ایک ایسے ہی شخص کے حوالے کر دے جو قرآن و اہلبیتؑ، اسلام و مذہب کو اسی طرح تباہ کر سکے جس طرح معاویہ خود چاہتا تھا لیکن حالات نے اس کی اجازت نہ دی تھی۔

یزید نے اپنے باپ کے دل کی یہ حسرت بھی نکال دی اور اس کے ایک ایک ارمان کو پورا کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے فرزندِ رسولؐ امام حسینؑ کے قتل کا سامان کیا اور اس حادثہ کو اس انداز سے صفحۂ وجود پر لے آیا جس کے تصوّر سے انسانیت کے جسم میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔

اس حادثہ کے دوسرے سال مدینہ کی تباہی کو مباح کیا۔ جس کی کیفیت یہ تھی کہ اس کا سفاک لشکر وحیٔ الٰہی کے شہر میں گھر گھر کا دورہ کر کے فساد و بربادی، قتل و غارت کا وہ بھیانک منظر پیش کر رہا تھا جس کی نظیر کسی بھی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ مخدّرات کی عفت پر یوں وحشیانہ حملے ہو رہے تھے جیسے باز شکار پر گر رہا ہو یا بھیڑیا بکریوں پر حملہ آور ہو۔

مروان بن الحکم ان حالات کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ اس کا دلی منشا تھا کہ بزرگانِ قوم، زعمائے عرب اور شجاعانِ اسلام کو مجبور کر کے ان سے غلامی کی بیعت لے لی جائے اور انھیں حکومتِ وقت کے احکام و قوانین میں جکڑ دیا جائے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ؕ

حکومت کے تیسرے سال یزید نے خانہ کعبہ کو منہدم کرا کے بنی امیہ کی آخری خواہش بھی پوری کر دی اور لات و ہبل کی بربادی کا آخری انتقام بھی لے لیا۔

یزید کے ان اسلام کش اور حیا سوز افعال کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ معاویہ کے ولیعہد کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیسا کہ یزید تھا۔

---

# شامِ الم

(۶)

یزید بن معاویہ کے بعد حکومت آل ابی سفیان سے آل حکم کی طرف منتقل ہوگئی۔ اس لئے کہ یزید کے بیٹے معاویہ کا دور نہایت ہی مختصر رہا۔ اس نے تختِ خلافت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ غاصبانہ طریقہ پر حاصل کی ہوئی خلافت کا وارث مجھ جیسا غیرت دار انسان نہیں ہوسکتا ہے۔

اس کے خطبہ کے بعض جملے یہ تھے "خلافت ایک خدائی رشتہ ہے جسے میرے دادا معاویہ نے ناجائز طور پر حاصل کیا تھا۔ اس لئے کہ حضرت علیؑ کے ہوتے ہوئے کوئی بھی اسکا اہل نہ تھا۔ اب معاویہ کا کردار لوگوں کے پیشِ نظر ہے۔ وہ زیرِ خاک اپنے گناہوں میں گرفتار ہے۔ میرے دادا کے بعد میرے باپ نے یہ عہدہ سنبھالا۔ اس نے بنتِ رسولؐ کے لختِ دل سے جنگ کی اور آخر کار خود بھی قبر کی تنگی کا شکار ہوگیا ـــــ اس کے بعد (ایک گریہ وبکا کے ساتھ) ـــــ ہمارے لئے سب سے عظیم بات یہ ہے کہ مجھے اس کا انجام معلوم ہے۔ اس نے فرزند رسولؐ کو قتل کیا ہے۔ شراب کو مباح کر کے خانہ کعبہ کو تباہ و برباد کیا ہے ـــــ میں نے جب خلافت کا لطف نہیں اٹھایا ہے تو اس کا بوجھ کیوں اٹھاؤں؟ تم لوگوں کو اختیار ہے جو طریقہ چاہو اختیار کرو۔ خدا کی قسم اگر یہ دنیا اچھی ہے تو مجھے اس کا ایک حصہ مل چکا ہے اور اگر یہ خراب ہے تو آل ابی سفیان کو اس میں سے بہت کچھ حاصل ہو چکا ہے"۔

(صواعق محرقہ ص۱۳۴)

یہ کہہ کر ـــــ منبر سے اتر آیا۔ وہ منبر جو مسلمانوں کے کاسۂ سر پر قائم ہوا تھا اور وہ خلعت اتار دیا جو ظلم و جور اور مکر و فریب سے بنا گیا تھا۔

حکومت مروان بن حکم کے ہاتھ آگئی۔ اگرچہ اس سلسلے میں جھگڑے، فسادات، فتنے اور شورشیں بھی ہوئیں۔

مروان کی خلافت بھی زیادہ دنوں نہ رہ سکی اور ۶۵ھ میں ہی اسے اس کی بیوی ام خالد بن یزید نے زہر دے کر ختم کر دیا۔

مروان کے بعد عبد الملک بن مروان کا دور آیا۔ اس دور میں بنی امیہ کی شورش کا پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ حکومت عبد اللہ بن زبیر کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور حضرت مختار بن ابو عبیدہ ثقفی بھی انتقامِ خونِ حسینؑ کی مہم میں مصروف تھے اور ان تمام فاسقوں اور فاجروں کا قلع قمع کر رہے تھے جن کے ہاتھ فرزندِ رسولؐ کے خون سے رنگین تھے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں عبد الملک کو کتنے تشدد سے کام لینا پڑا ہوگا۔ چنانچہ وہ ایک ایسا وحشی انسان بن گیا جس کی وحشت کی کوئی حد نہ ہو، ایک ایسا انتقام پسند جس کے دل میں رحم و کرم کی گنجائش نہ ہو اور ایک ایسا ظالم جس نے عدالت کا نام بھی نہ سنا ہو۔ اسکا دورِ حکومت صرف ظلم و جور، تشدد و سخت گیری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔

(۷)

عبد الملک ہی کے دور میں شبِ جمعہ ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ میں امام جعفر صادقؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ (ایک قول کی بنا پر ابتدائے رجب میں) جب کہ امت شدائد و آلام میں مبتلا تھی۔ حکامِ جور برسرِ اقتدار تھے۔ انسانیت کا خون ہو رہا تھا اور لوگ بے جرم و خطا موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔

امام صادقؑ گہوارۂ رسالتؐ میں کھیلے، بیتِ نبوت میں پلے بڑھے اور منزلِ وحی میں پروان چڑھے۔ آپ کی تربیت آپ کے جد بزرگوار امام زین العابدینؑ اور والد ماجد امام محمد باقر علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی۔

آپ نے بارہ پندرہ یا بقول مدائنی سولہ سال اپنے جد بزرگوار امام زین العابدینؑ کے زیرِ سایہ

گزارے جو تمام بنی ہاشم سے افضل، اہلبیتؑ کے سردار، اپنے زمانہ کے اعلم اور زہد و تقویٰ کی مکمل تصویر تھے۔ ان کے بعد ۱۹ سال تک اپنے والد ماجد امام محمد باقرؑ کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد امامت کی تمام ذمہ داریوں کے ساتھ امت کے سامنے جلوہ گر ہوئے۔

امام صادقؑ کا دور وہ تھا جب اہلبیتِ رسالتؐ سے ملنا ایک عظیم جرم تھا۔ ان کے چاہنے والے اور ان سے استفادہ کرنے والے انتہائی احتیاط و خاموشی کے ساتھ حاضر خدمت ہوا کرتے تھے کہ آلِ محمدؐ کی محبت کا اظہار بھی وہ جرم تھا جس کی سزا تاریکیٔ قبر تھی یا ظلمتِ زنداں۔

افکار کی پریشانی، بغض و حسد و ظلم و جور کی فراوانی اور خواہشات کی طغیانی کا دور دورہ تھا۔ لوگ چغل خوری، افترا پردازی اور بہتان تراشی کے ذریعہ حکومت سے تقرب حاصل کر رہے تھے۔ نہ نفس کی قیمت تھی نہ دین کی۔ نہ کوئی نظام تھا نہ کوئی قانون۔ خواہشات کی حکومت تھی اور عوام کی قسمتوں سے کھیل۔

ان تمام مصائب میں سب سے زیادہ حصہ دوستانِ اہلبیتؑ کا تھا کہ نمازوں کا خاتمہ سب و شتم حضرت علیؑ پر ہوتا تھا۔ مسجد، معبد، مجلس اور نشست گاہ کا نعرہ توہین اہلِ بیت تھا۔ خطیب، واعظ، داستان گو کا فریضہ ہتکِ آلِ محمدؐ تھا۔

آلِ محمدؐ اس تشدد کا مقابلہ کر رہے تھے اور چاہنے والے صبر آزما منزلوں میں قدم بڑھائے جا رہے تھے ــــــ اور یہ صادقِ آلِ محمدؐ کی عمر کی ابتدائی منزل تھی۔

آپ نے عبدالملک کی خلافت کے تین سال۔ ولید بن عبدالملک کی خلافت کے نو سال ۸ مہینے۔ سلیمان کی خلافت کے ۲ سال ۲ مہینے ۵ دن۔ عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے ۲ سال ۵ مہینے۔ یزید بن عبدالملک کی خلافت کے ۴ سال ایک مہینہ۔ ہشام بن عبدالملک کی خلافت کے ۱۰ سال۔ ولید بن یزید کی خلافت کا ایک سال۔ یزید بن ولید کی خلافت کے ۶ مہینے دیکھے ہیں۔ یہاں تک کہ ۱۳۲ھ میں بنی امیہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

امام صادقؑ نے ان تمام ادوار میں اس مصیبت کا بھی مشاہدہ کیا کہ آلِ محمدؐ کے دوستوں پر تشدد و مظالم کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ تہمتوں پر گرفتاریاں ہو رہی ہیں اور بڑے بڑے لوگ قتل کئے جا رہے ہیں۔

آپ نے ۱۹ سال تک سبِ علیؑ کا وہ سلسلہ بھی دیکھا جس میں روز جمعہ تمام علویین کو منبر کے قریب بٹھایا جاتا تھا تاکہ وہ علیؑ و آلِ علیؑ کے بارے میں سب و شتم کو باقاعدہ سن سکیں۔

(۸)

امام صادقؑ کا ابتدائی دور انتہائی رنج و محن اور مصائب و آلام میں گھرا ہوا تھا لیکن آپ نے کسی وقت بھی اعلاء کلمۂ حق اور اعلانِ حقیقت سے انحراف نہیں کیا بلکہ مذہبی طور پر لوگوں کو اس بات سے آگاہ کرتے رہے کہ ان ظالمین کی اعانت کرنا، ان کے پاس اپنے مقدمات کا لے جانا اور ان کی حکومت سے راضی رہنا اسلام کے لئے شدید خطرہ ہے۔

ادھر زید بن علیؑ نے کوفہ میں قیام کیا تو آپ نے ان کی تائید کرتے ہوئے لوگوں کو ان کی نصرت پر آمادہ کیا اور جب وہ شہید ہو گئے تو کلماتِ تعزیت بھی زبانِ مبارک پر جاری فرمائے۔ حالانکہ اس وقت زمامِ حکومت ہشام بن عبدالملک جیسے ظالم و جابر انسان کے ہاتھ میں تھی جس نے حضرت زید کے قتل کے بعد محبتِ اہلبیتؑ کو وہ ناقابلِ معافی جرم قرار دے دیا تھا جس کی بنا پر ہر سختی روا اور ہر ظلم جائز تھا۔ قید خانے آباد ہو رہے تھے اور حکومت کی طرف سے امداد کا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا۔

ہشام نے اپنے گورنر یوسف بن عمر ثقفی کو یہ حکم دے دیا تھا کہ جناب کمیت کے ہاتھ اور ان کی زبان قطع کر دے۔ اس لئے کہ انھوں نے زید کا مرثیہ کہا ہے۔

اہلِ مدینہ پر سختی کی جائے کہ انھوں نے زید کی طرف رجحان ظاہر کیا ہے اور آل ابوطالب سے مکمل طور پر برائت و بیزاری کا اعلان کر دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ حالات امام کے لئے انتہائی صبر آزما اور دشوار گزار تھے لیکن کیا کہنا عنایتِ پروردگار کا کہ لوگوں کے رجحانات آل محمدؐ کی طرف بڑھتے ہی رہے اور ان میں بنی امیہ کے خلاف ایک عظیم انقلاب برپا کر کے حکومت کو آلِ رسولؐ کے حوالے کر دینے کے جذبات ابھرتے ہی رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ خانگی اختلافات بڑھے اور اموی حکومت زوال کے راستہ پر لگ گئی۔

یہ زمانہ اگرچہ امام صادقؑ کے لئے مسرت خیز ہونا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ امام کا دل اس

دور کی بے دینی اور لا مذہبیت کو دیکھ کر برابر کڑھتا رہا اور آپ کی نظر میں اس غنیمت موقع پر اس سے بہتر کوئی بات نہ تھی کہ ایک مدرسہ فکر و نظر قائم کر کے لوگوں کو دین حق کی طرف متوجہ کیا جائے۔ احکامِ الٰہیہ کی اشاعت ہو، سوئے ہوئے احساس اور مرے ہوئے شعور کو زندگی ملے۔ کہ یہ زمانہ فاموی حکومت کی ضعیفی اور عباسی سلطنت کے بچپن کا زمانہ ہے اور ابھی ظلم کی تمام طاقتیں کمزور ہیں۔ چنانچہ آپ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ سلسلہ قائم کر دیا اور چار ہزار افراد آپ کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔

آپ کا گھر ایک دار العلوم (یونیورسٹی) کی شکل اختیار کیا گیا جہاں مختلف علمار کبار فقہ و حدیث، حکمت و کلام، تفسیر و دینیات کے علوم حاصل کر رہے تھے۔ ایک ایک وقت میں دو دو چار چار ہزار علما شریک درس ہو رہے تھے۔ (رسالۃ الاسلام عدد ۴ صلا)

اس درس میں صرف مقامی حضرات ہی شرکت نہ کرتے تھے بلکہ کوفہ، بصرہ، واسط و حجاز کے منتخب افراد دور دراز کی مسافت طے کر کے حاضر ہوتے تھے۔ عرب کے مختلف قبائل بنی اسد و مخارق و طے و سلیم و غطفان و غفار و خزاعہ و خثعم و مخزوم و بنی ضبہ و قریش کے سر برآوردہ لوگ استفادہ کر رہے تھے۔ (جعفرؑ بن محمد از سید الاہل)

امام صادقؑ سے روایت کرنے والے اور ان کے علوم سے استفادہ کرنے والے صرف عام علمار کرام ہی نہ تھے بلکہ وہ افراد بھی تھے جنھیں ایک جماعت کی امامت کا شرف حاصل ہو گیا تھا اور وہ بھی آپ کی شاگردی پر ناز کرتے تھے۔

اس فہرست میں یحییٰ بن سعید، ابن جریج، مالک بن انس، ثوری، ابن عیینہ، ابو حنیفہ، شعبہ، ایوب سجستانی وغیرہ کا نام بھی آتا ہے۔ (مطالب السئول ۲ ص۵۵)

اسلام میں فکر و نظر کے اعتبار سے یہ پہلا مدرسہ تھا جسے امام جعفر صادقؑ نے قائم کیا تھا۔ آپ کے درس میں علما، فقہ و حدیث کے علاوہ بڑے بڑے فلاسفہ و مناطقہ اور صاحبانِ فکر و نظر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ (تاریخ عرب امیر علی ص۱۷۹)

آپ کی زندگی کا یہ پہلا دور تھا جس میں مقابلہ بنی امیہ کی جاتی ہوئی حکومت سے تھا۔ اس کے بعد زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں تمام تر سابقہ عباسیوں کی اٹھتی ہوئی سلطنت

سے ہوا جس کے مختصر حالات یہ تھے۔

(۱)

جب ملتِ اسلامیہ نے ایک مدت تک بنی امیہ کی دین فروشی اور محسن کشی کا مشاہدہ کرلیا تو اس کے دل میں روز بروز ان کی طرف سے نفرت کے جذبات بھڑکنے لگے اور وہ اس نظام سے بیزاری کا اعلان کرنے لگی جس میں عدل و انصاف کا کوئی تصور نہ ہو۔ ادھر کربلا کا عظیم انقلاب جس نے ظالموں کی تباہی و بربادی اور جادۂ حق و صواب کے لئے روشنیوں کا انتظام کر دیا تھا سامنے آگیا۔ جس سے جذباتِ نفرت اور دو چند ہوگئے۔ امت نے اپنے دل میں یہ ٹھان لی کہ ایسے ظالم نظام کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ خفیہ طور پر مختلف جماعتیں تشکیل پائیں جن کا منشا صرف یہ تھا کہ حکومت کو بنی امیہ کے حکام جور سے لے کر آل محمدؐ کے حوالے کر دیا جائے کہ یہی حضرات ائمہ حق اور حکام عدل و انصاف ہیں۔

اس تحریک میں سب سے آگے آگے بنی عباس تھے اور انھیں کے ساتھ محمد بن عبداللہ بن الحسن ایک نمایاں سیاسی شخصیت کے مالک تھے چنانچہ بنی ہاشم نے ایک جلسہ کر کے انھیں اپنا اتفاقی رہنما تسلیم کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی۔ ان بیعت کرنے والوں میں سفاح اور منصور جیسے افراد بھی شامل تھے۔

انقلابی نعرے بلند ہوتے رہے اور انتقامی جذبات برافروختہ ہوتے رہے اور ایک دن گردشِ تقدیر نے بنی امیہ کے تاج و تخت کو الٹ دیا۔ ان کے دامنِ ظلم و جور کو آگ لگ گئی۔ خلقتِ خدا ان کے مظالم سے نجات پاگئی۔ ممالک اسلامیہ ان کے پنجۂ ظلم و استبداد سے آزاد ہوگئے اور مسلمان اس جدید دور کا انتظار کرنے لگے جس کی ریاست آل محمدؐ کو حاصل ہوگی جس میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔

(۲)

نئے نئے حالات رونما ہوئے۔ زمانہ کروٹیں بدلتا رہا۔ حکومت بنی عباس تک پہنچ گئی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ آلِ محمدؐ کا مصداق ہمارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ سفاح کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی تو انقلابات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دنیا بنی امیہ پر تنگ ہوگئی۔ بادشاہ نے

اپنے خاندان والوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ ہمدردی کا آغاز کر دیا اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش شروع کر دی کہ حکومت کا استحقاق صرف ایسے ہی لوگوں کو حاصل ہے۔ ادھر خونِ حسینؑ کے انتقام کی بھی مہم چل گئی۔ تاکہ بنی عباس سے بدظنی رکھنے والے لوگ بھی یہی سمجھیں کہ ان کی کوئی ذاتی غرض خلافت سے وابستہ نہیں ہے بلکہ صرف آلِ محمدؐ کی حمایت کرنا چاہتے ہیں۔

تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ سفاح دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس نے اپنے بھائی منصور کو اپنا نائب بنا دیا۔ منصور ایسا چالاک اور ہوشیار انسان تھا جو زمانہ کا صحیح مطالعہ کر کے اس سے زندگی کے سبق لے رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایسی احتیاط کے ساتھ گذاری کہ قریب سے قریب تر لوگوں پر بھی بھروسہ نہیں کیا۔ ابھی حکومت پورے طور پر مستقر نہیں ہوئی تھی۔ عباسیوں کو مختلف اطراف سے خطرہ لاحق تھا۔

ایک طرف علویین تھے جو یہ دیکھ رہے تھے کہ امت کی پوری توجہ حکومتِ وقت کی طرف صرف ہمارے اشتباہ میں ہے اور اس کے واقعی حقدار ہم لوگ ہیں۔ اس میں بنی عباس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

دوسری طرف خود انقلابی جماعت کے افراد تھے جنھیں یہ شک تھا کہ بنی عباس حکومت کو کسی دوسرے کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔

ان کے علاوہ بنی امیہ کے بچے ہوئے افراد خود ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے اور ہر آن ان کے انقلاب برپا کر دینے کا اندیشہ تھا۔ مدینہ کے علماء بنی عباس کی بیعت کے باطل ہونے کا اعلان کر رہے تھے جس کے نتیجہ میں منصور کی زندگی تلخ ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ علویین سے انتقام لینے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کی نظر میں علویین کی جماعت میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت امام جعفر صادقؑ کی تھی اس لئے نظر آپ پر پڑی اور آپ کو اپنے راستہ سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کے ذہن میں وہ ماضی بھی محفوظ تھا جب دربدری کی مصیبتیں اور قید خانہ کی اذیتیں آئے دن سامنے کھڑی رہتی تھیں اور ان سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ آلِ محمدؐ کی

حمایت تھا جس کی وجہ سے اس نے حدیث غدیر کی بھی روایت کردی تھی۔ (تاریخ بغداد ۲ ص۲۴۴)
وہ ان حالات سے بے حد پریشان تھا اور اپنے لئے کوئی مستقل فیصلہ نہ کرسکتا تھا۔

(۳)

منصور نے یہ دیکھا کہ وہ کل تک اس قوم میں ذلیل تھا جس میں آج امیر المومنین بن چکا ہے۔ وہ کل ایک ایک درہم کو محتاج تھا اور آج خزانہ میں دس سال تک حکومت کرنے کے لئے مال جمع ہے۔ کل راتوں کو تنہا مارا مارا پھرتا تھا اور آج ہزاروں افراد کا لشکر ساتھ چلتا ہے۔
اس انقلاب کا یہ اثر ہوا کہ وہ بات بات پر خائف رہنے لگا۔ ایک ایک پیسہ میں بخل کرنے لگا۔ اب اسے اپنے اقتدار کو بچانے کی فکر لاحق تھی۔ اس کی یہی وہ پست حرکت تھی جسے تاریخوں نے محفوظ کرلیا۔ اور دوانیقی (پیسے والا) کو اس کے نام کا جزو بنا دیا۔ وہ ایک طرف اپنے کپڑوں میں پیوند لگایا کرتا تھا اور دوسری طرف معمولی معمولی وہم پر لوگوں کو تہ تیغ کررہا تھا۔

اس نے لوگوں کو خفیہ طور پر مارنے کے لئے ایک عیسائی ڈاکٹر رکھ لیا تھا جسے مسلمانوں کے قتل کی کوئی پرواہ نہ تھی اور بادشاہ کے اشاروں پر لوگوں کو راہی عدم کردیا کرتا تھا۔
ایک مرتبہ منصور نے اسے پیغام بھیجا کہ محمد بن ابی العباس کا خاتمہ کردے۔ اس نے فوراً ایک زہر تیار کیا اور موقع کا منتظر رہا۔ اتفاقاً محمد کو کچھ حرارت محسوس ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹر کو دکھلایا۔ اس نے پینے کی دوا تجویز کی اور محمد کے اصرار پر خود ہی بناکر دے دی۔ محمد نے دوا پیتے ہی دنیا کو خیرباد کہہ دیا اور ان کی ماں نے منصور سے شکایت کی تو اس نے پہلے تو طبیب کو ۳۰ کوڑے لگواکر قید کردیا اور اس کے بعد آزاد کرکے تین سو درہم انعام دے دیا جو منصور کی شریعت میں ایک مقتول کی دیت فرض کی جاسکتی ہے۔ (طبری ۷، ص۳۰۹)
منصور نے حکومت کی پائیداری کے لئے ایک دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ لوگوں کو زندہ دیواروں میں چنوا دیا جائے۔ چنانچہ متعدد افراد اس ظلم کا بھی شکار ہوئے۔ بغداد کی دیواریں آج بھی اس بات کا اعلان کررہی ہیں کہ اگر انھیں تاب سخن اور طاقت اظہار دے دی جائے تو سب سے پہلے ان بے گناہوں کے خون کا اعلان کریں گی جنھیں زندگی ہی میں ان کے حوالے

کر دیا گیا تھا۔

منصور شفقت و محبت اور رحم و کرم کے معانی سے بالکل نا آشنا تھا۔ وہ ایک ایسا ظالم اور سفاک انسان تھا جسے وحشت ناک اور درد انگیز مناظر بھی کسی قسم کی ہمدردی پر نہ اکسا سکتے تھے۔

ایک مرتبہ حج کے موقع پر اس کا جلوس عبداللہ بن حسن کی لڑکی کے پاس سے ہو کر گزرا عبداللہ اس وقت منصور کی قید میں تھے۔ بیٹی نے باپ پر مرحمت کی درخواست پیش کر دی اور اس سلسلے میں چند اشعار بھی پڑھے لیکن منصور نے اس کا جواب یہ دیا کہ تو نے اچھا یاد دلایا اور یہ کہہ کر حکم دے دیا کہ انھیں قید ہی میں ختم کر دیا جائے۔

یہ تھی منصور کی ظالمانہ اور وحشیانہ طبیعت جس میں رحم و رافت، محبت و انسانیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسے نہ قرابت کا خیال تھا نہ رشتہ داری کا۔ ظاہر ہے کہ پھر ایسے ظالم شخص سے اہلبیت عصمتؑ ہی کے بارے میں کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

(۴)

منصور یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا ملک اس وقت تک پائیدار نہیں ہو سکتا ہے جب تک آل محمدؐ کی کوئی ایک فرد بھی عالم وجود میں باقی رہے۔ اس لئے اس نے قتل و برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی اور آخرکار ایک مرتبہ حج کے بہانے سے مدینہ بھی پہنچ گیا تاکہ اپنے ظلم و تشدد کی رفتار اور اس کے ردّ عمل کا مشاہدہ کر سکے۔

مدینہ میں داخل ہوتے ہی اس نے بنی حسنؑ کے ان افراد کو جو ریاح کے زندان سے آزاد تھے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا اور اولادِ علیؑ انتہائی بے دردی سے گرفتار ہونے لگی۔

عباس بن حسن بن حسن اپنے دروازہ پر اپنی ماں کے سامنے کھڑے تھے کہ ان گرفتاری کے لئے پولیس آگئی۔ ماں نے بڑے حسرت و یاس سے یہ تقاضا کیا کہ ایک مرتبہ اپنے لال کو گلے لگا کر رخصت کر دے لیکن ظالموں نے اس درخواست کو بھی قبول نہ کیا۔

ادھر محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان بن عفان کو گرفتار کرا کے اپنے سامنے حاضر کرایا اور انھیں سخت سست کلمات سنائے اور حکم دے دیا کہ ان کا پاجامہ پھاڑ دیا جائے تاکہ برہنہ ہو جائیں اور انھیں اتنے تازیانہ لگوائے کہ سارا جسم لہولہان ہو گیا۔

اسی دوران میں آپ کو اپنے بھائی عبداللہ بن حسن کے پہلو میں بٹھایا گیا۔ پیاس کا شدید غلبہ تھا لیکن افسوس کہ آپ کے مطالبہ پر بھی کسی شخص نے پانی نہ دیا۔ یہاں تک کہ ایک خراسانی نے رحم کھا کر سیراب کر دیا۔

اس کے بعد منصور نے حکم دے دیا کہ ان تمام اسیروں کو پابہ زنجیر کر کے مدینہ سے عراق روانہ کر دیا جائے۔

اب کیا تھا قیدیوں کے گرد سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ اور اولادِ رسولؐ اس آخری قید خانہ کوفہ کی طرف منتقل کی جا رہی تھی جہاں رات اور دن کا امتیاز ناممکن تھا۔

منصور نے ان افراد کو تہ خانہ میں رکھا اور ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ایک بھیڑیا اپنے شکار کے ساتھ بھی نہیں کرتا ہے۔ ان میں اگر کوئی مر بھی جاتا تھا تو اس کا جنازہ یوں ہی پڑا رہتا تھا اور یہ لوگ ان تمام مصائب میں بھی نامِ خدا لے کر صبر کر رہے تھے۔ سارا وقت تلاوتِ قرآن اور نمازوں میں گذارتے تھے لیکن دشواری یہ تھی کہ نماز کے اوقات کا اندازہ بھی نہ ہوتا تھا۔ تلاوتِ قرآن سے وقت کا اندازہ کرتے تھے۔ مگر افسوس کہ منصور نے اس ظلم پر بھی اکتفا نہ کی اور آخر کار قید خانہ کو ان کے سروں پر منہدم کرا کے سب کا خاتمہ کرا دیا۔

(۵)

حقیقت امر یہ ہے کہ ان دونوں ادوار میں امام صادقؑ نے انتہائی مشکلات و مصائب کا مقابلہ کیا ہے۔ بنی امیہ کے دور میں آپ بنی ہاشم کے سردار اور سرکارِ رسالتؐ کے وارث ہونے کی حیثیت سے حکومت کی نظروں میں سمائے رہے اور وہ ہر آن آپ کے خاتمہ کی تدبیر میں مصروف اور اپنے وراثتی حالات کی بنا پر اظہارِ عداوت میں سرگرم عمل رہے۔ یہ اور بات ہے کہ قدرت اپنے فضل و کرم سے امام کو بچانے میں مصروفِ تدبیر تھی۔

بنی عباس کا دور آیا تو اس میں بھی آپ حکومت کی نظروں میں رہے اس لئے کہ وہ حکومت ہی آلِ محمدؐ کے نام پر حاصل کی گئی تھی اور آپ ان کے راس و رئیس کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی ذاتِ مبارک ایک نمایاں امتیاز کی مالک تھی۔

سفاح نے بظاہر اپنے دور میں کسی حد تک نرمی سے کام لیا تھا لیکن منصور کا دور آتے ہی

ربیع کے ذریعہ آپ کو انعام اور صلے بھی دیئے۔ ربیع آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میں نے آپ کے آنے کے قبل اور بعد میں عجیب تفاوت دیکھا ہے۔ آخر اس کا سبب کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ دعا پڑھ لی تھی جس کی وجہ سے محفوظ رہا۔

اللھم احرسنی بعینك التی لا تنام واکفنی برکنك الذی لا یرام واغفرلی بقدرتك علی لا اھلك وانت رجائی اللھم انك اکبر واجل ممن اخاف واحذر اللھم بك ادفع فی نحرہ واستعین بك من شرہ۔

(صفوۃ الصفوۃ ابن جوزی ۲ ص ۹۶ فصول مہمہ مالکی ص ۲۰۷، ارشاد مفید ص ۲۵)

منصور کے ذہن میں یہ بات راسخ تھی کہ کسی طرح امام کا خاتمہ ہونا چاہیئے اور وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہا تھا کہ ہزاروں افراد آپ کی امامت کے معتقد ہیں۔ آپ کو اموال بھیجتے ہیں اور آپ کی عظمت و بزرگی کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ خود منصور کے پہلو نشین افراد بھی آپ کی طرف میلان رکھتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ اس نے آپ کے امتحان کی غرض سے ابن مہاجر کو کچھ مال دے کر روانہ کیا کہ وہ مدینہ جا کر عبداللہ بن حسن، امام صادق اور دیگر حضرات کو یہ مال زکوٰۃ دیدے اور اپنے کو خراسان کا شیعہ بتائے اور ان حضرات سے رسید لکھوالے۔

وہ شخص مدینہ گیا اور جب پلٹ کر آیا تو منصور نے اس سے کیفیت معلوم کی۔ اس نے سب کے خطوط دیئے اور صرف امام صادق کی کوئی رسید نہ تھی۔

منصور نے اس کا سبب دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ میں جس وقت پہنچا وہ مسجد رسولؐ میں مشغول نماز تھے۔ میں بیٹھ گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمانے لگے۔ اے شخص خدا کا خوف کر اور آل محمدؐ کو فریب نہ دے اور منصور سے بھی یہی کہہ دینا اس لئے کہ وہ بھی بنی مروان کے دور سے قریبی زمانے ہی میں ہے اور پھر بھی محتاج ہیں۔

ابن مہاجر کہتا ہے کہ میں نے حضرت سے اس کلام کا مطلب دریافت کیا تو آپ نے مجھے قریب بلا کر اس پوری گفتگو کو دہرا دیا جو میرے اور تیرے درمیان ہوئی تھی۔

منصور یہ سن کر مدہوش ہو گیا اور کہنے لگا کہ سچ ہے۔ ہر دور میں اہلبیتؑ میں ایک الہامی

شخصیت رہی ہے۔ آج وہ شخصیت جعفرؑ بن محمدؑ کی ہے۔ (ابن شہر آشوب ۲ ص۳۰۲)

امام کے بے پناہ علم و تدبر کا نتیجہ تھا کہ منصور کے تمام منصوبے ناکام ہو گئے اور وہ کسی معقول وجہ سے امام کے خون کو حلال نہ بنا سکا۔ اس نے شیعوں کے نام سے خطوط لکھے۔ زکوٰۃ وغیرہ کے اموال بھیجے۔ رسیدوں کا جھگڑا نکالا مگر اس کے باوجود امام کے کسی فعل کی گرفت نہ کر سکا۔ اس کی نظر میں تمام اہلبیتؑ سے زیادہ خطرناک شخصیت حضرت ہی کی تھی۔ وہ دس سال تک آپ کے ساتھ رہ کر بنی امیہ کے دور میں آپ کی بے پناہ صلاحیت کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آپ اس دور کی علمی رفتار کے قائد اعظم ہیں۔ آپ کے پاس تمام عرب کے علماء و فقہاء و فلاسفہ حاضر ہو کر تحصیلِ علوم کر رہے ہیں۔ اہلِ حدیث و اہلِ قیاس کے معرکے بھی آپ ہی کی فکرِ بلیغ سے سر ہوئے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ امامؑ ہی نے محمد بن عبداللہ کو اقدام کرنے سے روکا ہے اور ان کی بیعت کو قبل از وقت قرار دیا ہے۔ لیکن سوچتا یہ تھا کہ ایسا نباضِ وقت اور بابصیرت انسان کسی وقت بھی اس انقلاب کی قیادت کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مسلسل تاک میں لگا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ امام کی وسعتِ فکر و نظر کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکا۔

امامؑ کی سیاست یہ تھی کہ امورِ حکومت میں مداخلت نہ کی جائے اور اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے برابر علویین کو انقلاب سے روکا۔ اور جب ابوسلمہ خلال نے آپ کو خلافت دینا چاہی تو آپ نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اس نے اصرار کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ستر ہزار افراد پر مشتمل لشکر حاضر ہے، اب بھی سوچ لیجئے۔ آپ نے پھر وہی انکار کیا اور فرمایا کہ یہ حکومت آج سفاح کے ہاتھوں میں ہے اور کل منصور کو ملے گی۔

(مناقب ابن شہر آشوب ۲ ص۲۱۰)

ایران کے سربراہ ابومسلم خراسانی نے آپ کے سامنے حکومت کی پیشکش کی اور یہ عرض کیا کہ میں نے آلِ محمدؐ کی مظلومی اور بنی امیہ کے مظالم کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو اہلبیتؑ کی طرف موڑ دیا ہے۔ آپ حکومت چاہتے ہیں تو لے لیجئے۔ اب کسی مزید زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا کہ "نہ تم میرے کام آؤ گے اور نہ زمانہ میرے لئے سازگار ہے۔"

(الملل والنحل ا ص۲۴۱)

یہی وہ وسعتِ نظر اور دور اندیشی تھی جس کی بنا پر آپ نے ہر ایسی دعوت کو ٹھکرا دیا جس کی بنیاد خلوص و مذہب پر نہ ہو اور برابر یہ ظاہر کرتے رہے کہ یہ لوگ میرے ہمراز و دمساز نہیں ہیں۔ ان کے اغراض میرے واقعی مقاصد سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ خلافت بنی ہاشم میں صرف عباسیوں کو ملے گی اور اسی بنیاد پر نفس زکیہ کو اقدام کرنے سے روک دیا تھا۔

یہ بات آپ کے لئے کوئی تعجب خیز نہ تھی اس لئے کہ ائمہ اہلبیتؑ اکثر قبل از وقت امور کی خبر دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ بنی عباس کی لامحدود سلطنت اور ان کے بے پناہ ظلم و تشدد کے اشارے بھی ان حضرات کے کلمات میں بکثرت پائے جا رہے تھے۔

(ابن الفوطی مورخِ عراق)

---

# امام صادقؑ

۱۔ آپ کی شخصیت کے بارے میں اعترافات

۲۔ آپ کی علمی حیثیت

۳۔ آپ کے امراء و خلفاء

۴۔ آپ کا مدرسہ اور اس کے طلاب

# جائزۂ تاریخ

تاریخ ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جو اپنی تمام صورتوں کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رکھتا ہے۔ وہ کسی ایک قوم یا مذہب سے مخصوص نہیں ہے۔ اس کی حیثیت اس معتبر امین کی ہے جو اپنی امانت میں کسی وقت بھی خیانت نہیں کرتا ہے۔ وہ ایسا امانت دار جوہر ہے کہ جس میں غلط عناصر شامل بھی کر دیئے جائیں تو ایک نہ ایک دن ان کو الگ کر کے بے نقاب کر دے گا۔

صحیح تاریخ اپنے واقعات میں کسی رو رعایت کی قائل نہیں ہے۔ وہ تمام واقعات و حادثات کو ان کی صحیح شکل میں محفوظ رکھتی ہے اور بلا کم و کاست ہر دور کے انسان کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔

کبھی کبھی سیاسی بازیگر تاریخ کے دامن کو داغدار بنانے کے لئے اس کے حقائق کو مسخ کر دیتے ہیں اور اس کی آزادی کو سلب کر کے اسے اپنے ذاتی اغراض کا اسیر بنا لیتے ہیں اور پھر اس بات کا موقع نہیں دیتے ہیں کہ وہ اپنے صحیح فریضہ کو ادا کر سکے۔ لیکن یہ امانت دار اپنے دامن کے کسی نہ کسی گوشہ میں حقائق کو چھپا لیتا ہے تاکہ آنے والی نسلوں کو ان کی طرف متوجہ کر کے اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو سکے۔

تاریخ پر یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ اسے شخصیت کا آئینہ دار ہونے کے بجائے شخصیت کا خدمت گذار بنا دیا جائے لیکن وہ اس جکڑ بند کے باوجود اپنا فریضہ ادا کرتی ہے۔ اس نے ہمیشہ

---

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

# عطر بار کلمات

ہر دور میں اللہ ہم اہلبیتؑ میں سے ایک حجت کو رکھتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنا فرض ہدایت ادا کرے اور آج ہمارے زمانے میں حجتِ خدا میرے بھتیجے جعفرؑ ہیں، جن کا اتباع باعثِ نجات اور جن کی مخالفت سببِ ہلاکت ہے۔ (مناقب ابن شہر آشوب ۲ ص۱۴۷)

—— زیدؑ بن علیؑ

جعفرؑ پروردگار کے اس قول ثم اورثنا الکتاب کے مصداق ہیں۔ وہ وارث کتاب بھی ہیں اور سابق فی الخیرات بھی۔ (یعقوبی ۲ ص۱۷۷)

اس کے علاوہ اہلبیتؑ کی حیثیت الہامی ہوتی ہے اور اس دور میں ان کی فرد جعفرؑ بن محمدؑ ہیں۔ (مناقب ۲ ص۳۰۲)

—— منصور دوانیقی

میں جعفرؑ بن محمدؑ کے پاس بارہا حاضر ہوا اور انھیں یا تو نماز کی حالت میں پایا یا روزہ کے عالم میں یا پھر تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے۔ (تہذیب)

علمی اعتبار سے جعفرؑ بن محمدؑ سے بہتر انسان نہ آنکھوں نے دیکھا ہے اور نہ کانوں نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے تصور میں آیا ہے۔ عبادت و زہد و تقویٰ میں بھی آپ کا یہی عالم تھا۔ (تہذیب ۲ ص۱۰۴)

—— مالک بن انس

میں جب بھی جعفرؑ بن محمدؑ کو دیکھتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ انبیاء کے وارث ہیں۔ (تہذیب ۲ ص۱۰۴)

عمرو بن المقدام ـــــــ

میں نے جعفرؑ بن محمدؑ سے بہتر فقیہ نہیں دیکھا ہے۔ جب کہ منصور نے انھیں بلایا اور مجھ سے کہا کہ لوگ جعفرؑ بن محمدؑ کے گرویدہ ہوئے جا رہے ہیں۔ ان کے لئے سخت ترین مسائل تیار کرو۔ میں نے چالیس مسئلے تیار کئے اور پھر مجھے حیرہ سے بلا بھیجا۔ میں پہنچا تو حضرت جعفرؑ بن محمدؑ موجود تھے۔ میں نے جیسے ہی آپ کو دیکھا۔ ایک ہیبت طاری ہو گئی۔ میں نے سلام کیا اور حکم پاکر بیٹھ گیا۔

منصور نے امام سے کہا کہ یہ ابو حنیفہ ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔

اس کے بعد مجھے حکم دیا کہ میں سوالات پیش کروں۔

چنانچہ میں نے سوالات شروع کئے اور انھوں نے جوابات دینا شروع کر دیا۔ جس کا انداز یہ تھا کہ تم لوگوں کی رائے یہ ہے، اہلِ مدینہ کا خیال یہ ہے اور ہمارا فتویٰ یہ ہے۔ کبھی آپ کا فتویٰ کسی کے موافق ہوتا تھا اور کبھی بالکل خلاف۔

یہاں تک کہ میں نے تمام مسائل پوچھ لئے اور سچ تو یہ ہے کہ روایت کی بنیاد پر سب سے بہتر انسان وہ ہوتا ہے جو اختلافی مسائل پر زیادہ نظر رکھتا ہو۔ (مناقب ابی حنیفہ ۱ ص۱۷۳۔ جامع اسانید ابو حنیفہ ۱ ص۲۲۲۔ تذکرۃ الحفاظ ۱ ص۱۵۷)

ابو حنیفہ ـــــــ

یہ بشر نہیں ہے، یہ تو ایک ایسی ذات ہے کہ جب چاہے جسمانی بن جائے، اور جب چاہے روحانی بن جائے۔

ابن ابی العوجاء ـــــــ

جعفرؑ بن محمدؑ علم کامل اور ادب تام کے مالک اور زہد و ورع میں بے نظیر تھے۔ ایک مدت تک مدینہ میں رہ کر اپنے شیعوں پر فیضانِ علوم کرتے رہے اور اس کے بعد عراق میں بھی عالم رہا۔ نہ کبھی حکومت کی خواہش کی اور نہ خلافت کا جھگڑا اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ دریائے معرفت میں غوطہ زن ساحل کیا جانے ؛ اور حقیقت کی بلندیوں پر پہنچ جانے والا پستی کا کیا خوف

رکھے ؛ (الملل والنحل ا ص ۲۷۲)

## محمد بن عبدالکریم شہرستانی

امام صادق اپنے خاندان میں اپنے والد کے واقعی وارث تھے۔ آپ سے اس قدر علوم نقل کئے گئے ہیں کہ کسی اور سے نقل نہیں ہوئے ہیں۔ آپ حدیث میں راس و رئیس تھے اور آپ سے یحییٰ بن سعید، ابن جریح، مالک بن انس، ابن عیینہ، ابو ایوب بجستانی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

## قرمانی

جعفرؑ بن محمدؑ فقہ و علم و فضل کے اعتبار سے اہلبیتؑ کے سردار تھے۔

## ابن حیان

جعفرؑ بن محمدؑ ایسے معتبر انسان تھے جن کے بارے میں سوال اٹھانا غلط ہے۔

## حافظ ابو حاتم

جعفرؑ بن محمدؑ علماء و سادات اہلبیتؑ میں سے تھے۔ علم و عبادت، زہد و تقویٰ کے اعتبار سے نمایاں شخصیت رکھتے تھے۔ معانیٔ قرآن، حقائق تاویل، جواہر تنزیل کے واقف اور اپنے اوقات کے باقاعدہ محاسب تھے۔ ان کے دیکھنے سے آخرت کی یاد اور ان کا کلام سننے سے دنیا میں زہد و تقویٰ کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ ان کی اقتداء جنت کی ضامن اور ان کا چہرہ خاندانِ نبوت کا گواہ تھا۔ امت کے بڑے بڑے علماء و فضلاء یحییٰ بن سعید، ابن جریح، مالک بن انس، ابن عیینہ، ابو ایوب بجستانی وغیرہ نے ان سے استفادہ کیا ہے اور اس شاگردی کو اپنے لئے فضل و کمال سمجھا ہے۔ (مطالب السئول ۲ ص ۵۵)

## کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی

جعفرؑ بن محمدؑ امام ناطق اور افضل امت تھے۔ آپ نے عبادت کو اپنا شعار بنایا۔ گوشۂ عافیت میں زندگی گذاری اور ریاست و اجتماعات سے علیحدگی اختیار کی۔ (حلیۃ الاولیاء ۳ ص ۱۹۲)

## ابو نعیم

حضرت جعفر بن محمدؑ بن علیؑ بن الحسینؑ اپنی عبادتوں کی وجہ سے ریاست سے بالکل الگ

تھے۔ (صفوۃ الصفوۃ ۲ ص۹۴)

## ____ عبدالرحمن بن جوزی

جعفرؑ بن محمدؑ بن علیؑ بن الحسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ کی کنیت ابو اسماعیل، القاب طاہر و فاضل اور سب سے مشہور لقب صادق تھا۔ (تذکرۃ الخواص ص۳۵۱)

## ____ ابوالمظفر یوسف

میں نے اسی مسجد کوفہ میں ۹۰۰ بزرگوں کو جعفرؑ بن محمدؑ سے روایت بیان کرتے سنا ہے۔ (مجالس سنیہ ۵ ص۲۰۹)

## ____ حسن بن علی الوشاء

جعفرؑ بن محمدؑ کے دروازے پر علماء کا ہجوم رہتا تھا اور چنے ہوئے لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ آپ سات سال کے سن سے گہرے مطالب اور پیچیدہ حقائق بیان کیا کرتے تھے۔ (مناہج التوسل ص۱۰۶)

## ____ عبدالرحمن بن محمد الحنفی البسطامی

جعفرؑ بن محمدؑ نے اپنے علم و فقہ سے دنیا کو پر کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابو حنیفہ اور سفیان ثوری ان کے شاگرد تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بات ان کے بارے میں کافی ہے۔ (رسائل جاحظ ص۱۰۶)

## ____ ابوبحر الجاحظ

جعفرؑ بن محمدؑ ایک راست گو فقیہ تھے۔ (تقریب التہذیب ص۶۸)

## ____ ابن حجر عسقلانی

حضرت صادقؑ کے مناقب جلیل اور ان کے اوصاف کامل تھے۔ وہ اپنے آباء کرام کی سیرت پر قائم اور ان کے علوم کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنے کو زہد و تقویٰ، اطاعت و عبادت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان کے اوراد و وظائف کا یہ عالم تھا کہ جسے آسمان بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

## ____ ابوالفتح اربلی

ابوعبداللہ امام اعظم جعفر صادق صاحبِ معجزات و کرامات تھے۔ غیب کی خبریں دیا کرتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ ام فروہ بنتِ قاسم بن محمد بن ابوبکر تھیں کہ جن کی ماں اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر تھیں اس لئے آپ اپنے کو ابوبکر کی اولاد میں شمار کرتے تھے۔ آپ ۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں انتقال فرما کر بقیع میں دفن ہوئے۔ (غایۃ الاختصار ص۶۲)

——— محمد بن حمزہ بن زہرہ نقیب حلب

جعفر بن محمدؑ سے اتنے علوم نقل ہوئے ہیں کہ جن کا چرچا شہر بشہر اور دیار بہ دیار تھا۔ اکابر یحییٰ بن سعید، ابن جریح، مالک، سفیان، ابوحنیفہ، شعبہ، ابوایوب جیسے افراد نے آپ سے روایت کی ہے۔ (صواعق ص۱۲۰)

——— احمد بن حجر

حضرت صادقؑ مدینہ میں جمعہ کے دن طلوعِ فجر کے وقت ۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ۶۵ سال کی زندگی پائی اور ۳۴ سال امامت کی۔ آپ سے مختلف المذاہب علماء نے اتنے علوم نقل کیے ہیں کہ جن کا شہرہ تمام آفاق میں ہے۔ آپ سے روایت کرنے والوں کی تعداد چار ہزار ہے۔ شوال ۱۴۸ھ میں وفات پائی اور بقولے منصور نے زہر دیا اور بقیع میں اپنے آباء کرام کے پہلو میں دفن ہوئے۔ (صحاح الاخبار ص۴۴)

——— محمد سراج الدین رفاعی

حضرت جعفر کا لقب صداقتِ لہجہ کی بنا پر صادق تھا۔ آپ کیمیا، جفر، فال وغیرہ میں ماہر تھے۔ ۸۰ھ میں مدینہ میں متولد ہوئے۔

——— عمرو بن الوردی

حضرت صادقؑ ——— ابوعبداللہ، امام، سید، ہاشمی، علوی، حسینی، مدنی تھے۔ آپ کے القاب صابر، فاضل، طاہر اور مشہور ترین لقب صادق ہے۔ آپ سے ابوحنیفہ، ابن جریح، شعبہ، سفیان اور مالک وغیرہ نے حدیث نقل کی ہے۔ (النجوم الزاہرہ ۲ ص۸)

——— جمال الدین ابوالمحاسن

جعفر صادقؑ ائمہ اثنا عشر میں چھٹے امام تھے۔ آپ کی والدہ ام فروہؓ بنت قاسمؒ بن محمدؒ بن

ابی بکر تھیں۔ آپ مدینہ میں ۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ امام باقر کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ اپنے والد بزرگوار کے زیر تربیت رہے۔ آپ سے امام ابو حنیفہ نے بھی شرف شاگردی حاصل کیا ہے۔ آپ ہر علم میں وسعت نظر رکھتے تھے۔ بالخصوص جعفر و کیمیا۔ آپ سے اس فن کو جابر نے بھی حاصل کیا تھا۔ زہد و تقویٰ، قناعت و حسن اخلاق میں آپ کا مثل نہ تھا۔ صدق حسب کی بنا پر آپ کا لقب صادق تھا۔ منصور آپ کا احترام کرتا تھا اور آپ سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ ابو مسلم خراسانی نے ابتدا میں حکومت آپ ہی کو پیش کی تھی لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ آپ کے سات لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ ۱۴۸ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں مدینہ میں انتقال فرمایا اور اپنے آبا و اجداد کے جوار میں دفن ہوئے۔ مذہب شیعہ آپ ہی کی نسبت سے جعفریہ کہلاتا ہے۔ (قاموس الاعلام)

جعفرؑ بن محمدؑ ہاشمی مدنی المعروف بہ امام صادقؑ کی امامت متفق علیہ ہے۔ آپ کی والدہ ام فروہ بنت قاسم تھیں۔ (شرح الشفا، ۲ ص۳۵)

## ملا علی القاری

جعفرؑ بن محمدؑ کی کنیت ابو عبد اللہ آپ کی والدہ ام فروہ ان کی والدہ اسماء تھیں۔ آپ سادات اہلبیتؑ میں سے تھے۔ آپ نے اپنے والد ماجد اور محمد بن منکدر اور عطاء بن ابی رباح سے سنا ہے اور آپ سے عبد الوہاب ثقفی، حاتم بن اسماعیل، وہیب بن خالد، حسن بن عیاش، سلیمان بن بلال، ثوری، داوردی، یحییٰ بن سعید، حفص بن غیاث، مالک بن انس اور ابن جریج نے روایت کی ہے۔ آپ ۸۰ھ میں متولد ہوئے اور ۱۴۸ھ میں ۶۴ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ (الجمع بین رجال الصحیحین ۱ ص۷۰)

## محمد بن طاہر بن علی المقدسی

(امام کے غیر معصوم سے روایت کرنے کی ذمہ داری راوی پر ہے۔ جوادی)

جعفر صادقؑ ہاشمی قرشی فرقۂ امامیہ کے چھٹے امام تھے۔ علمی اعتبار سے آپ کی منزل بہت بلند تھی۔ آپ کے شاگرد ابو حنیفہ، مالک، جابر بن حیان وغیرہ جیسے افراد تھے۔ صدق لہجہ کی بنا پر صادق لقب پایا۔ بنی عباس کے ساتھ آپ کا طرز زندگی معروف ہے۔ اظہار حق

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] —

[illegible]
[illegible]
[illegible] —

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] —

[illegible]

[illegible]
[illegible] —

— [illegible]

[illegible]
[illegible] —

[illegible]

[illegible]
[illegible]

سے بڑے بڑے فلاسفہ استفادہ کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ (تاریخ عرب ص۱۷۹)

——— امیر علی ہندی

امام جعفر صادق خاندانِ علوی کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی کنیت ابو عبداللہ، ابو اسمٰعیل القاب صادق، طاہر، فاضل وغیرہ تھے۔ آپ سے اتنے علوم نقل کئے گئے ہیں کہ ان کا چرچا تمام عالم میں ہے۔ بڑے بڑے علمار یحییٰ، مالک، ابوحنیفہ وغیرہ نے آپ سے روایت کی ہے۔ (جواہر الکلام ص۱۳۰)

——— محمد ابن وہیب بغدادی

حضرت امام جعفرؑ بن محمدؑ ہاشمی مدنی اور صادق تھے۔ آپ کی والدہ ام فروہ بنتِ قاسم بن محمد بن ابی بکر تھیں۔ آپ نے اپنے والد، قاسم بن محمد، نافع، عطار، محمد بن منکدر اور زہری سے روایت کی ہے۔ اور آپ سے محمد بن اسحاق، یحییٰ انصاری، مالک، سفیان، ابن جریج، شعبہ، یحییٰ القطان وغیرہ نے روایت کی ہے۔ آپ کی امامت اور جلالتِ قدر متفق علیہ ہے۔ عمرو بن ابی المقدام کے قول کے مطابق آپ کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کی شخصیت ساری نبوتوں کا خلاصہ ہے۔ (تہذیب الاسمار ا ص۱۵۵)

——— ابو زکریا محی الدین بن شرف

نوٹ: امام کے دوسروں سے روایت کرنے کی ذمہ داری ابو زکریا پر ہے۔ (جوادی)

حضرت جعفر صادق سے مالک، سفیان، ابن جریج، ابن اسحاق وغیرہ نے روایت کی ہے۔ آپ کی امامت، سیادت اور جلالت متفق علیہ ہے۔ آپ کی ولادت ۸۰ھ اور وفات ۱۴۸ھ میں ہے۔ ایک قول کی بنا پر آپ کو زہر دیا گیا۔ شافعی، ابن معین، ابو حاتم، ذہبی وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے۔ آپ فضلاء و علمار اہلبیتؑ میں شمار ہوتے تھے۔ (شرح الشفار)

——— احمد شہاب الدین خفاجی

حضرت جعفرؑ بن محمدؑ ایسے مستجاب الدعوات تھے کہ جب بھی اللہ سے کوئی دعا کی تو کلام کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس شے کو اپنے سامنے حاضر پایا۔ (نور الابصار)

——— شبلنجی

حضرت جعفر بن محمدؑ علوی نسب اور سردار بنی ہاشم تھے۔

ـــــ ذہبی

حضرت جعفر بن محمدؑ فقیہ صادق تھے۔

ـــــ زرقانی

حضرت ابوعبداللہ جعفرؑ بن محمدؑ مذہب اثنا عشریہ کے ایک امام تھے۔ سادات اہلبیتؑ میں شمار ہوتے تھے۔ صدق لہجہ کی بنا پر صادقؑ لقب پایا تھا۔ آپ کے فضائل محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ (وفیات الاعیان)

ـــــ ابن خلکان

جانِ نبوت، اصل مروت وفتوت حضرت ابوعبداللہ جعفرؑ بن محمدؑ صادق۔ باپ کے رشتے سے علوی اور ماں کی طرف سے حضرت ابوبکر کی نسل سے تھے۔ ۸۰ھ میں مدینہ میں متولد ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ بقیع میں پدر بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے جہاں خاندان کے بہت سے بڑے بزرگ مدفون ہیں۔ صدق مقال کی وجہ سے صادق لقب پایا۔ علوم توحید میں بہترین مقالات انشاء فرمائے۔ آپ کے شاگرد جابر بن حیان نے ایک کتاب میں آپ کے ۵۰۰ رسالے جمع کئے ہیں۔ (مرآۃ الجنان ا صفحہ ۳۰۴)

ـــــ یافعی

کواکب ج ا صفحہ ۹۴ میں علامہ مناوی آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کے بہت سے کرامات ومکاشفات مشہور ہیں۔ منجملہ، ایک شخص نے منصور کے پاس آکر شکایت کی۔ منصور نے اسے بلاکر قسم لی تو اس نے قسم بھی کھالی لیکن حضرت نے فرمایا کہ جیسے میں تعلیم دوں اس طرح قسم کھائے۔ اس نے طریقہ دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی طاقت سے بیزاری اور اپنی طاقت پر اعتماد کی قسم کھائے۔ اس نے پہلے تو انکار کیا لیکن تھوڑی دیر بعد تیار ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسم کھاتے ہی راہئ ملکِ عدم ہوگیا۔ (زہق الباطل)

کسی شخص نے آپ کے غلام کو قتل کر دیا تو آپ نے رات بھر نمازوں میں اس کے لئے بد دعا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سحر کے وقت دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔

حکم بن عباس کلبی نے جناب زید کی شان میں کچھ گستاخانہ شعر کہے۔ جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے بد دعا کی جس کا اثر یہ ہوا کہ اسے شیر نے پھاڑ ڈالا۔

طبری نے ابن وہب کے ذریعہ لیث بن سعد سے نقل کیا ہے کہ میں ۱۱۳ھ میں حج کے موقع پر نمازِ عصر پڑھ کر کوہ ابو قبیس پر گیا تو دیکھا کہ ایک شخص دعا پڑھ رہا ہے۔ عالم یہ ہے کہ ایک سانس تک یارب کہتا ہے۔ پھر ایک سانس تک یا حیّ۔ اس کے بعد عرض کرتا ہے خدایا، مجھے انگور کی ضرورت ہے۔ مالک میری چادر کہنہ ہوگئی ہے۔ اب جو دعا ختم ہوتے ہی دیکھا گیا تو ایک ٹوکری انگور نازل ہو چکا تھا۔ یہ تھے امام جعفر بن محمدؑ۔

### ـــــ مناوی

چھٹے امام جعفر صادقؑ فضائل کثیرہ اور مناقب مشہورہ کے مالک تھے۔ آپ سے مالک بن انس، ابوحنیفہ، یحییٰ بن سعید، ابن جریح، ثوری وغیرہ نے روایت کی ہے۔ آپ ۸۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ آپ کے کمالات کے نقوش زمانہ کی پیشانی پر کندہ اور محافلِ عزت و شرافت کی زینت ہیں۔ (اتحاف الاشراف ص۵۴)

### ـــــ عبداللہ الشبراوی

ابوعبداللہ جعفر بن محمدؑ صادق مدنی، ہاشمی اور سرآمد روزگار تھے۔ آپ نے اپنے آباء و اجداد سے روایت کی ہے اور ان کے علاوہ ابن موسیٰ، شعبہ، ہر دو سفیان وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شافعی، ابن معین اور ابو حاتم نے آپ کی توثیق کی ہے۔ ۶۷ سال کے سن میں ۱۴۸ھ میں آپ نے وفات پائی۔
(خلاصہ ص۶۲)

### ـــــ جوزی

ابوعبداللہ جعفر صادقؑ سادات اہلبیتؑ میں سے تھے۔ صدق لہجہ کی وجہ سے صادق لقب پایا۔ ۸۰ھ میں متولد ہوئے۔ مالک بن انس، ابوحنیفہ اور اکثر علماء مدینہ نے آپ سے روایت کی ہے۔ (التشریع الاسلامی ص۲۶۳)

### ـــــ محمد خضری

شیعی فقہ کے لئے اپنے دور بلکہ ہر دور کی سب سے بڑی شخصیت امام صادقؑ کی تھی۔ آپ اپنے زمانہ اور اپنے بعد کے ادوار کے لئے سب سے بڑی حیثیت کے مالک تھے۔ منصور کی

حکومت کے دسویں سال میں آپ نے انتقال فرمایا۔

ــــــ ڈاکٹر احمد امین

جعفرؑ بن محمدؑ مسلمانوں کے لئے وہ قابلِ فخر امام تھے جو دنیا سے آج تک نہیں اٹھے بلکہ ہر آنے والے دن میں ان کی ایک نئی آواز گونجتی ہے۔ جس سے اہل "زہد و تقویٰ" پرہیزگاری کا اور "اہل علم و فضل" علم و کمال کا درس لیتے ہیں۔ آپ کی آواز پریشان حال کو سکون کی راہ دکھلاتی ہے۔ مجاہد کو جوش دلاتی ہے۔ تاریکیوں میں نورانیت پھیلاتی ہے۔ عدالت کے قصر کی بنیادیں قائم کرتی ہے اور مسلمانوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اب بھی ایک نقطہ پر جمع ہو جاؤ۔ دیکھو تمھارا خدا بھی ایک ہے اور نبی بھی ایک ہے۔ (جعفر بن محمدؑ ص ٦)

ــــــ عبدالعزیز سید الاہل

حضرت جعفرؑ بن محمدؑ کا مکان ایک مدرسہ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں حدیث و تفسیر و حکمت و کلام کے بڑے بڑے علماء جمع ہوتے تھے۔ آپ کے درس میں کبھی دو ہزار اور کبھی چار ہزار علماء حاضر ہوتے تھے۔ آپ کے شاگردوں نے آپ کے تعلیمات کو کتابوں کی شکل میں اس طرح مرتب کیا ہے کہ ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت پیدا ہو گئی ہے۔

ــــــ محمد صادق نشأت استاد کلیۂ آداب جامعہ قاہرہ

ابو عبداللہ جعفر بن محمدؑ الصادق مذہب امامیہ کے امام اور سادات اہلبیتؑ نبوی کی ایک فرد تھے۔ راست گوئی کی وجہ سے آپ کا لقب ہی صادقؑ ہو گیا۔

ــــــ فرید وجدی

جعفرؑ بن محمدؑ سادات اہلبیتؑ میں سے تھے۔ صدق کلام کی وجہ سے صادق لقب پایا۔ علم کیمیا، زجر، فال وغیرہ میں آپ کے بہت سے مقالات ہیں۔ آپ کے شاگرد جابر بن حیان نے آپ کے ۵۰۰ رسالے جمع کئے ہیں۔ ادیب، متقی، دیانتدار ہونے کے ساتھ اپنی سیرت میں حکیمانہ رفتار رکھتے تھے۔ (دائرۃ المعارف ٦ ص۴۶۵)

ــــــ بطرس بستانی

انسان جس وقت پاک ضمیر، سالم عقل، غیر جانبدار علم کے ساتھ صحیح اصول اور محکم قوانین کی روشنی میں امام جعفرؑ بن محمدؑ کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ آپ کی زندگی ایک فلسفی مجموعہ ہے جو اپنے اعتماد پر قائم ہے۔ جس میں پھڑکتی ہوئی نبضِ حیات،

جگمگاتی ہوئی عقلیت و روحانیت، جدّت طراز افکار اور تازہ بہ تازہ احکام پائے جاتے ہیں۔

——— عارف ثامر، الاب آ، عبدہٗ خلیفہ یسوعی

اس وقت ہم انھیں اقوالِ زریں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور انشاء اللہ آیندہ کسی موقع پر معصر علمار مسلمین کے اقوال بھی پیش کریں گے لیکن ایک بات کی طرف متوجہ کر دینا ضروری ہے کہ بعض علمار نے اپنے کلام میں علمِ زجر و فال کی نسبت امام صادقؑ کی طرف دی ہے حالانکہ یہ غلط ہے مستقبل کے بارے میں آپ کا علم کبھی تو موجودہ حوادث پر آپ کی مکمل بصیرت کا نتیجہ ہوتا تھا اور کبھی آپ کے باطنی صفائے نفس کی بنا پر ہوتا تھا جیسا کہ آپ نے خبر دی تھی کہ پہلے خلافت سفاح کو ملے گی، اس کے بعد منصور اور پھر اسی کی اولاد میں رہ جائے گی۔ اسی طرح آپ نے منصور کے ہاتھوں محمد اور ابراہیم کے قتل کی خبر دی تھی۔ اسی طرح آپ نے محمد بن عبداللہ کی بیعت سے منع فرمایا تھا جب کہ تمام بنی ہاشم بیعت پر آمادہ تھے۔ اور آپ نے فرمایا تھا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے جس پر عبداللہ بن حسن نے کہہ دیا کہ مجھے زیادہ علم ہے اور آپ نے ابوعباس پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسے اور اس کی اولاد کو ملے گی تمھیں نہ ملے گی۔ پھر جب تشریف لے چلے تو عبدالصمد اور منصور ساتھ چلے اور انھوں نے دوبارہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں بہتر سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔

غرض اس قسم کے واقعات بے شمار ہیں اور ان پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ رہ گیا زجر و فال کا قصہ، تو وہ اس شبہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ اس کے ماہر فن کا نام بھی جعفر بن محمد تھا جو بلخ کا رہنے والا اور ابومعشر فلکی کے نام سے مشہور تھا اور اپنے علم میں کامل دستگاہ رکھتا تھا جیسا کہ اس کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

ابن کثیر نے بھی بدایۃ و نہایۃ ۱۱ ص۵ پر تحریر کیا ہے کہ زجر و فال کی نسبت آپ کی طرف اشتباہ سے دے دی گئی ہے۔ وہ جعفر بن ابی معشر فلکی کا کام تھا جو کہ صادق نہ تھا۔ یہ تو لوگوں کی کذب بیانی سے ایسا حادثہ ہو گیا ہے۔

———

# امام صادقؑ
# بحیثیتِ مُعلّم

۱۔ آپ کا مدرسہ
۲۔ آپ کے شاگرد

# مرکز تعلیم

(۱)

اس بات میں سر مو مبالغہ نہیں ہے کہ امام صادقؑ کا بیت الشرف ایک ایسا علمی مرکز تھا جس نے علمی ذخیروں کے ساتھ ہزاروں صاحبانِ فکر و نظر اور عالمانِ فقہ و حکمت کی دولت امتِ اسلامیہ کے حوالہ کی ہے۔ آپ کے مدرسۂ فکر کے فارغ التحصیل افراد کی تعداد ۴ ہزار تک بتائی جاتی ہے جیسا کہ حافظ ابو العباس بن عقدہ نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔

ارشاد میں شیخ مفیدؒ کا بیان ہے کہ "اصحاب حدیث نے امام صادقؑ سے روایت کرنے والے مختلف المذاہب معتبر راویوں کی تعداد ۴ ہزار بتائی ہے۔"

شیخ محمد بن علی فتال فرماتے ہیں کہ "اصحابِ حدیث نے آپ سے روایت کرنے والے مختلف العقیدہ لوگوں کی تعداد ۴ ہزار تک بیان کی ہے۔"

سید علی بن عبد الحمید زینی صاحبِ کتاب الانوار تحریر فرماتے ہیں کہ "عامہ و خاصہ میں یہ بات مشہور ہے کہ آپ سے روایت کرنے والوں کی تعداد ۴ ہزار تک ہے۔"

شیخ طبرسی اعلام الوریٰ میں رقم طراز ہیں کہ "اتنے علوم کسی دوسرے انسان سے نقل نہیں کئے گئے ہیں جتنے امام صادقؑ سے نقل ہوئے ہیں، اس لئے کہ آپ سے روایت کرنے والوں کی تعداد ۴ ہزار ہے۔"

ابن شہر آشوب مناقب میں لکھتے ہیں کہ "آپ سے ۴ ہزار مختلف العقیدہ معتبر افراد نے

مختلف علوم نقل کئے ہیں۔"

محقق نے معتبر میں فرمایا ہے کہ "آپ کے علوم محیر العقول ہیں اور آپ سے روایت کرنے والوں کی تعداد تقریباً ۴ ہزار ہے۔"

شہید اوّل نے ذکری میں ذکر کیا ہے کہ "امام صادق کے مسائل کے جوابات کو ۴ سو کتابوں میں جمع کیا گیا ہے اور آپ سے روایت کرنے والے عراق، شام اور حجاز کے چار ہزار افراد تھے۔"

علامہ شیخ حسین فرماتے ہیں کہ "عامہ وخاصہ میں آپ کے نمایاں شاگرد ۴ ہزار تھے۔

(۲)

بہر حال آپ کا مدرسہ امت اسلامیہ کے لئے علوم کا مصدر ومنبع اور فیوض کا وہ سرچشمہ تھا جس نے عالم اسلام کی روحانی پیاس بجھائی تھی اور امت کو اس علم نواز دور کے لئے ایک ذخیرہ عطا کر دیا تھا۔

کاش اس مدرسہ کو پوری آزادی دے دی جاتی تو آج مسلمانوں کو علمی بھیک نہ مانگنا پڑتی اور امت کا دامن گوناگوں مشکلات کے حل سے خالی نہ ہوتا، بلکہ اسلام میں برادری کے جذبات، اجتماعی عدالت کے احساسات اور فاسد خیالات کو محو کرنے کے سرمائے ہوتے مگر افسوس کہ حکومتِ وقت نے پوری کوشش سے اس مدرسہ کو توڑنے کی فکر کی کہ اس کی شہرت سے حکام کی نیند اڑ گئی تھی۔ انھیں اہلبیتؑ کے سیاسی اقتدار کے خواب نظر آنے لگے تھے۔ ان کا یہ سیاسی فریضہ ہو گیا تھا کہ اس مدرسہ کے دروازے بند کر کے بانیٔ مدرسہ کی زندگی کے خاتمہ کی فکر کریں کہ سارے عالم کی نظریں اسی مدرسہ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دنیا کے بڑے بڑے بزرگ افراد اسی مدرسہ سے استفادہ کر رہے تھے۔ اسلام کے ہر ہر مرکز پر اسی کا چرچا ہو رہا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ مدرسہ ایسے منتخب افراد پیدا کر رہا تھا کہ اگر آج بھی اسلامی تمدن اور عربی افکار کی بنیاد تلاش کی جائے تو اس کے علاوہ کہیں اور نہ ملے گی۔ اس مدرسہ نے امت کو استنباطِ احکام اور تنقید کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اسی نے تالیف وتبویب کے طریقے سکھائے ہیں۔ اسی نے علماء وطلاب کے باہمی ربط کے اصول قائم کئے ہیں۔ یہ اور

بات ہے کہ حکومتِ وقت اپنے ارادہ سے باز نہ آئی اور اپنی جدوجہد میں لگی رہی۔

(۳)

اس مدرسہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے روحانی استقلال کی بنا پر کسی حکومت کے اشاروں پر نہیں چلا۔ اس نے نہ حکام کی دخل اندازی قبول کی اور نہ ان کے مشوروں کی ضرورت محسوس کی۔

یہی وجہ تھی کہ حکومتِ وقت اسے اپنا آلۂ کار نہ بنا سکی اور اس کے ذریعہ اپنے شخصی مصالح کے استعمال سے عاجز رہی۔

اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا کہ اس کی بنیاد ظالمین سے مقابلہ پر رکھی گئی تھی۔ اور اس کا مقصد ان سے ہر قسم کے تعلقات کا قطع کرنا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی نظریں ادھر متوجہ ہوگئیں اور یہ مدرسہ خطرہ میں پڑگیا۔

اصولِ مدرسہ اور نظامِ حکومت کی ایک داخلی جنگ شروع ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ نزاع شدت اختیار کرگئی اور مدرسہ کا وجود خطرہ میں پڑگیا۔ لیکن کیا کہنا بانیٔ مدرسہ کا کہ وہ اپنے صبر و استقلال کی بنا پر ان تمام حملوں کا نہایت ہی پامردی سے مقابلہ کرتا رہا اور کسی آن بھی اپنے نظام کو حکومت کا تابع نہ بننے دیا۔

آخر کار منصور نے عاجز آکر لالچ دلانا شروع کی اور امام کو خوش کرنے کے لئے یہ نئی پالیسی اختیار کی لیکن یہ طریقہ بھی کامیاب نہ ہوسکا کہ حضرت نے حکومت سے مکمل علیحدگی کا اعلان کرکے اپنے اصحاب کو اس بات کی بھی تعلیم دے دی تھی کہ وہ حکومت سے کھلم کھلا بیزاری کا اعلان کرتے رہیں۔

---

# تشنگانِ علوم

(۴)

آپ کے شاگردوں کے متعلق علماء کا یہ اتفاق ہے کہ ان کی تعداد چار ہزار تک پہنچی ہوئی تھی بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ تعداد صرف ان شاگردوں کی تھی جو ایک معتبر حیثیت کے مالک تھے ورنہ عام شاگرد اس سے کہیں زیادہ تھے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت ان تمام افراد کا تفصیلی تذکرہ نہیں ہو سکتا ہے اور اسے ہم نے آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے لیکن بعض ایسے شاگردوں کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے جنھوں نے عالمِ علم وحدیث میں شہرت پائی ہے اور اپنے زمانہ میں ایسی حدیث پیدا کر لی تھی کہ انھیں بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ نے بھی صاحبِ حدیث قرار دیا ہے۔

ان میں سے بعض افراد وہ ہیں جنھیں ایک طائفہ کا رئیس اور ایک مذہب کا امام تسلیم کیا گیا ہے جیسے :-

* ابوحنیفہ نعمان بن ثابت م ۱۵۰ھ۔ جن کا قول تھا کہ "میں نے حضرت جعفر بن محمدؑ سے زیادہ صاحبِ علم دیکھا ہی نہیں ہے"۔

"اگر دو سال جعفر بن محمدؑ کی شاگردی نہ کرتا تو ہلاک ہو جاتا"۔

یہ امام کی خدمت میں مدینہ و کوفہ دونوں جگہ حاضر ہوئے ہیں اور مدینہ میں دو سال تک مسلسل آپ سے استفادہ کیا۔

★ مالک بن انس متوفی ۱۷۹ھ ۔ جن کا کہنا تھا کہ "جعفر بن محمدؑ سے بہتر انسان آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔" (تحفۂ اثنا عشریہ)

★ سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ ۔ جن کا مذہب چوتھی صدی کے بعد تک رائج رہا اور جنھوں نے امام سے استفادہ کر کے ان مطالب کو بصورت حدیث نقل کیا تھا۔

★ سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ ۔ جو ایک دور کے رئیس مذہب تھے ۔ حجون میں ان کی قبر ہے اور اپنے دور کے بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے ۔

اس کے علاوہ کبار علماء کی ایک فہرست ہے جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں :۔

★ شعبہ بن الحجاج بن الورد العتکی متوفی ۱۶۰ھ ۔ آپ کے روایات اصحاب صحاح نے نقل کئے ہیں اور شافعی نے یہاں تک لکھا ہے کہ "اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں کوئی حدیث کا پہچاننے والا نہ ہوتا۔" احمد کا خیال تھا کہ شعبہ مستقل ایک امت ہیں۔"

★ فضیل بن عیاض بن سعد بن بشیر تیمی یربوعی متوفی ۱۸۷ھ ۔ آپ کے بارے میں جزری کا کہنا ہے کہ آپ ائمہ ہدیٰ میں سے تھے ۔ اور آپ سے اعمش، سلیمان، ابن مبارک، ابن قطان، احمد بن مقدام وغیرہ نے روایت کی ہے ۔ نسائی وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے۔ بخاری، ترمذی و نسائی نے آپ کے روایات نقل کئے ہیں ۔ (تہذیب التہذیب)

★ حاتم بن اسمٰعیل متوفی ۱۸۰ھ ۔ کوفہ کے رہنے والے تھے ۔ آپ کے احادیث بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ نے نقل کئے ہیں ۔ معتبر انسان تھے ۔ خود آپ نے امام صادقؑ سے روایات لئے ہیں اور آپ سے بہت سے علماء و محدثین نے ۔ (خلاصۃ الکمال ص۵۶)

★ حفص بن غیاث بن طلق بن معاویہ بن مالک کوفی متوفی ۱۹۴ھ ۔ آپ نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے ۔ اور آپ سے احمد، اسحٰق، ابونعیم، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، عفان بن مسلم وغیرہ نے ۔ آپ پہلے بغداد کے قاضی تھے پھر معزول ہو کر کوفہ کے قاضی ہوئے۔ کثیر الحدیث اور حافظ تھے ۔ ۳-۴ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں ۔ (تاریخ بغداد ج ۸ ص۱۸۸، خلاصہ ص۷۴)

★ ابوالمنذر زہیر بن محمد تیمی خراسانی م ۱۶۲ھ ۔ آپ نے امام صادقؑ سے اور آپ سے

ابوداؤد طیالسی، روح بن عبادہ، ابو عامر عقدی، عبدالرحمٰن بن مہدی، ولید بن مسلم، یحییٰ بن بکیر، ابوعاصم وغیرہ نے روایت کی ہے۔ احمد یحییٰ، عثمان دارمی نے آپ کی توثیق کی ہے۔

★ حافظ یحییٰ بن سعید بن فروخ القطان بصری متوفی ۱۹۸ھ۔ آپ سے ابن مہدی، عفان، مسدد، احمد، اسحٰق و ابن معین وغیرہ نے روایت کی ہے اور اصحاب صحاح نے اس کا ذکر کیا ہے۔

★ اسمٰعیل بن جعفر بن ابی کثیر انصاری متوفی ۱۸۰ھ۔ آپ سے محمد بن جہضم، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، ابوالربیع الزہرانی، ابو معمر ہذلی وغیرہ نے روایت کی ہے۔

ابن سعید کا قول ہے کہ یہ ایک مرد معتبر مدینہ کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے بغداد میں آکر ساکن ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ ان کے روایات بخاری، مسلم وغیرہ نے ذکر کئے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱ صـ۲۸۲)

★ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی المدنی متوفی ۱۹۱ھ۔ آپ نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے اور حلال و حرام میں ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ آپ سے ابراہیم بن طہمان، ثوری، ابن جریج، شافعی، سعید بن ابی مریم، ابونعیم وغیرہ نے روایت کی ہے اور آپ کا شمار شافعی کے بزرگوں میں تھا۔ شافعی نے اکثر آپ کا ذکر کیا ہے۔ آپ پر ایک تہمت یہ ہے کہ بزرگوں کی توہین کیا کرتے تھے اور اسی لئے غلط گو تھے۔ لیکن غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ آپ احادیث اہلبیتؑ کو زیادہ بیان کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب ۱ صـ۱۵۹)

★ ابو عاصم ضحاک بن مخلد بصری متوفی ۲۱۲ھ۔ آپ نے خود امام صادقؑ سے اور آپ سے بخاری، ابن حنبل، ابن مدینی، اسحٰق، راہویہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن شیبہ نے آپ کو بے مثل انسان قرار دیا ہے۔

★ محمد بن فلیح بن سلیمان المدنی متوفی ۱۷۰ھ۔ آپ کے روایات بخاری، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کئے ہیں۔

★ عبدالوہاب بن عبدالمجید بن الصلت متوفی ۱۹۴ھ۔ آپ سے شافعی، ابن حنبل، یحییٰ بن معین، ابن مدینی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ منصور کے زمانہ میں بغداد تشریف لائے

اور وہیں یہ روایتیں بیان کیں۔ ابن معین نے آپ کی توثیق کی ہے۔ آپ کی آمدنی ۲ لاکھ ہزار سالانہ تھی جسے اصحاب حدیث پر صرف کیا کرتے تھے۔ آپ کی روایتیں مسلم و بخاری نے نقل کی ہیں۔

★ ابو معاذ عثمان بن فرقد البصری۔ بخاری اور ترمذی نے آپ کے روایات نقل کئے ہیں۔ ابن مدینی، ابن مثنیٰ اور زید بن حزم آپ کے راوی تھے۔ ابن حبان نے آپ کو صحیح الحدیث قرار دیا ہے۔

★ عبدالعزیز بن عمران بن عبدالعزیز الزہری متوفی ۱۹۷ھ۔ آپ کے روایات ترمذی نے نقل کئے ہیں۔

★ عبداللہ بن رکین کوفی۔ یحییٰ وضاحی اور موسیٰ بن اسمٰعیل نے آپ کی روایتیں بیان کی ہیں اور بخاری نے انھیں نقل کیا ہے۔

★ زین بن عطا بن السائب۔ اسرائیل و جریر بن عبدالحمید نے آپ سے روایت کی ہے۔ ابو حاتم نے آپ کی توثیق کی ہے اور نسائی اور ترمذی نے حدیث نقل کی ہے۔

★ مصعب بن سلام تیمی کوفی۔ آپ سے احمد اور ابو سعید نے روایت کی ہے۔ ترمذی نے اسے نقل کیا ہے۔ ابن معین اور ابو حاتم نے آپ کی توثیق کی ہے۔

★ بشیر بن میمون خراسانی متوفی ۱۸۲ھ۔ آپ سے احمد بن عاصم خراسانی نے روایت کی ہے۔ آپ بغداد آئے تو امام صادق سے حدیث نقل کی ہے جسے ابن ماجہ نے درج کیا ہے۔

★ ابراہیم بن سعد الزہری متوفی ۱۸۳ھ۔ احمد بن حنبل کے استاد اور صحاح ستہ کے رجال میں سے ہیں۔

★ سعید بن مسلمہ الاموی متوفی ۲۰۱ھ۔ شافعی کے استاد اور صحاح کے رجال میں سے ہیں۔

★ حارث بن عمیر بصری۔ مکہ میں امام صادق سے روایت کی اور آپ سے ابن عیینہ، ابن مہدی اور ابو اسامہ نے روایت نقل کی ہے۔

★ مفضل بن صالح اسدی کوفی۔ ترمذی نے آپ کے روایات نقل کئے ہیں۔

★ ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی بصری۔ آپ سے اعمش، قتادہ، بردد حماد و سفیان وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن سعد و ابن معین نے آپ کی توثیق کی ہے۔ ۶۶ھ سال تولد ہے اور ۱۲۱ھ سال رحلت ہے۔

★ عبدالملک بن جریح قرشی متوفی ۱۴۹ھ۔ کہا جاتا ہے کہ آپ سب سے پہلے مصنف ہیں۔

★ اس کے علاوہ بکثرت علماء ہیں جنھوں نے امام صادقؑ سے استفادہ کیا ہے اور آپسے حدیثیں نقل کی ہیں جن کا تذکرہ تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب التہذیب، میزان الاعتدال، تذکرۃ الحفاظ، خلاصہ جزری، تاریخ خطیب، الجرح والتعدیل، ابن ابی حاتم وغیرہ میں ملتا ہے۔ بعض علماء اعلام نے اعداد و شمار کے لئے مستقل رسالے بھی تالیف کئے ہیں جن کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

ان حضرات کے علاوہ آپ کے وہ خاص تلامذہ جنھوں کے آپ سے علمی و فقہی استفادہ کر کے اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ اجتماعی و سیاسی امور کی قیادت کر سکیں۔ اہل کفر و الحاد سے مقابلہ اور فاسد العقیدہ افراد سے مناظرہ کر کے دین اسلام کی صحیح حمایت کر سکیں۔ ان کی زندگی کا تفصیلی تذکرہ آئندہ ہوگا۔ اس وقت صرف بعض کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

★ ابان بن تغلب۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ امام سجادؑ، امام باقرؑ اور امام صادقؑ کی خدمت میں رہے۔ امام صادقؑ کے زمانۂ حیات میں انتقال فرمایا۔

◆ شیخ طوسی نے فہرست میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ "معتبر" جلیل القدر اور اصحاب کے نزدیک عظیم المرتبت تھے۔ امام سجادؑ، امام باقرؑ، امام صادقؑ سے ملاقات کی اور سب سے روایت بھی کی۔ امام باقرؑ نے تو آپ سے فرمایا تھا کہ مسجد مدینہ میں بیٹھ کر فتویٰ دو اس لئے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے شیعوں میں تم جیسے صاحبانِ فتویٰ رہیں۔ آپ مختلف علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ کی کتاب معانی القرآن، القراآت اور اصول روایت کا تذکرہ ابن ندیم نے اپنی فہرست میں کیا ہے۔ (ابن ندیم ص۳۰۸)

◆ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ ابان نے کوفہ میں منصور کے زمانۂ حکومت

اور عیسیٰ بن موسیٰ کے دورِ ولایت میں انتقال کیا ہے۔ آپ ایک ثقہ انسان تھے، جن سے شعبہ نے روایت کی ہے۔

❖ تہذیب میں ہے کہ آپ سے موسیٰ بن عقبہ، شعبہ، حماد بن زید اور ابن عیینہ وغیرہ نے روایت کی ہے اور احمد، یحییٰ، ابو حاتم اور نسائی وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے۔

❖ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ ابان بن تغلب کوفی خالص شیعہ تھے لیکن صادق القول تھے، لہٰذا ان کے صدق لہجہ پر عمل کیا جائے اور ان کی بدعت ان کے حوالے کر دی جائے۔ احمد بن حنبل، ابن معین، ابو داؤد وغیرہ نے آپ کی توثیق کی ہے اور مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ نے آپ کی روایت نقل کی ہے۔ (ذہبی نے اپنے ذوق کی بنا پر تشیع کو بدعت سے تعبیر کیا ہے ورنہ جناب ابان کسی خاص بدعت کے موجد نہ تھے۔)

❖ جوزجانی کا کہنا ہے کہ ابان گمراہ اور فاسد المذہب تھے۔ ابن حجر نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ جوزجانی کی تنقید کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ابان شیعہ تھے اور تشیع اس دور کی اصطلاح میں یہ تھا کہ حضرت علیؑ کو ان کی جنگوں میں برحق تسلیم کیا جائے اور ان کے مخالف کو خطا وار قرار دیا جائے اور شیخین کی فضیلت کو اپنے مقام پر محفوظ رکھا جائے۔ بعض لوگ حضرت علیؑ کو رسول اللہؐ کے بعد سب سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن ایسا شخص بھی پرہیزگار اور صادق القول ہو تو اس کی روایت کو ترک نہیں کیا جا سکتا ہے۔

★ ابان بن عثمان بن احمر بجلی۔ آپ کبھی بصرہ میں رہتے تھے اور کبھی کوفہ میں لیکن اصلی وطن کوفہ تھا۔ اہل کوفہ نے آپ سے بے شمار روایات نقل کئے ہیں، جنھیں آپ امام صادقؑ امام کاظمؑ وغیرہ سے بیان کیا کرتے تھے۔ آپ کی کتاب کا نام کتاب المبتدی البعث والمغازی والوفاۃ ہے۔ ابن حبان نے آپ کا ذکر ثقہ افراد میں کیا ہے۔ محمد بن ابی عمر کا کہنا ہے کہ ابان سب سے بہتر حافظہ کے مالک تھے۔ آپ کا ذکر جمیل بن دراج، عبد اللہ بن مسکان، عبد اللہ بن بکیر، حماد بن عیسیٰ، حماد بن عثمان اور ابان بن عثمان جیسے ان چھ اصحاب میں ہوتا ہے جن کی روایت کی صحت پر تمام اصحاب کا اتفاق ہے۔

★ بکیر بن اعین الشیبانی ۔ زرارہ کے بھائی تھے۔ امام باقرؑ و صادقؑ سے روایت کرتے تھے۔ امام صادقؑ کے دور میں انتقال کیا۔ جب آپ کو خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ بکیر رسول اللہ اور امیرالمومنینؑ کے جوار میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد دعائے رحمت فرمائی۔ ان کا شمار معتبر راویوں میں ہوتا ہے۔

★ جمیل بن دراج بن عبداللہ النخعی ۔ امام کاظمؑ و صادقؑ سے روایت کرتے تھے۔ امام رضاؑ کے دور میں انتقال فرمایا۔ ان کا شمار بھی چھ معتبر اور صحیح الروایۃ اصحاب میں ہوتا ہے۔

★ حماد بن عثمان بن زیاد رواسی کوفی ۔ امام صادقؑ و کاظمؑ و رضاؑ سے روایت کرتے تھے۔ ان کی روایتیں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ حارث ابن مغیرہ نصری، امام باقرؑ، صادقؑ، کاظمؑ سے روایت کرتے تھے۔ آپ کی روایتیں بہت زیادہ مقبول ہیں۔

★ ہشام بن الحکم البغدادی الکندی ۔ آپ کی کنیت ابو محمد یا ابوالحکم تھی۔ کوفہ وطن تھا۔ لیکن بغداد منتقل ہو گئے تھے۔ ابن ندیم کا کہنا ہے کہ شیعہ علمِ کلام کے ماہر تھے۔ امام صادقؑ کے بلند پایہ اصحاب میں شمار ہوتے تھے۔ حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ جب یہ پوچھا گیا کہ کیا معاویہ بھی جنگِ بدر میں شریک تھا؟ تو فرمایا کہ "ہاں اُس طرف سے"۔ مامون کے دورِ خلافت میں انتقال کیا۔ آپ کی کتابوں کے نام کتاب الامامت، کتاب الدلالات وغیرہ ہیں جن کی تعداد ۲۰ تک پہنچتی ہے۔ امام صادقؑ نے آپ کے لئے دعا کی کہ جب تک ہماری نصرت کرتے رہو روح القدس تمھاری تائید کرتا رہے۔ ابتداء امر میں جہم بن صفوان کے اصحاب میں تھے۔ اس کے بعد امام صادقؑ کے اصحاب میں داخل ہو گئے۔ آپ نے یہ تصدیق کی کہ "یہ قلب و زبان سے میرا مددگار ہے"۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا "ہشام بن الحکم ہمارے حق کا طلبگار اور ہمارا مددگار ہے۔ ہمارے کلام کا موید اور ہمارے دشمنوں کا باطل شکن ہے"۔ ہشام کا مشہور مقولہ یہ ہے کہ یہ مخالفین بھی عجیب مزاج رکھتے ہیں جس کو اللہ نے بلند کیا ہے اس کو گرانے کی فکر میں ہیں اور جس کو اللہ نے معزول کر دیا ہے اسے منصب دار بنانا چاہتے ہیں۔ ہشام کے مناظروں اور مباحثوں کی فہرست بہت طولانی ہے جسے یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جناب کلینی نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص شام سے امام صادقؑ کی

خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ میں علم فقہ و کلام کا ماہر ہوں، آپ کے اصحاب سے مناظرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تیری یہ گفتگو کلام رسول سے ماخوذ ہے یا تو مستقل طور پر کہہ رہا ہے۔ اس نے کہا کچھ آنحضرتؐ سے ماخوذ ہے اور کچھ میرا ذاتی حصّہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تو رسولؐ اللہ کا شریک ہے؛ اس نے عرض کیا "نہیں"۔ آپ نے فرمایا کہ تجھ پر وحی آئی ہے؛ عرض کیا نہیں! فرمایا کیا رسول اللہ کی طرح تیری اطاعت بھی واجب ہے؛ عرض کیا، ہرگز نہیں! آپ نے اصحاب کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ اس نے اپنے دعویٰ کو خود ہی باطل کر دیا۔ یہ کہہ کر آپ نے خیمہ سے باہر سر نکالا تو ایک ناقہ سوار کو آتے ہوئے دیکھا۔ فرمایا کہ ہشام بن الحکم آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہشام حاضر خدمت ہو گئے۔ ان کی کم سنی کا یہ عالم تھا کہ سبزہ آغاز ہو رہا تھا اور اصحاب میں ان سے کم سن کوئی نہ تھا۔ امامؑ نے ہشام کا استقبال کیا اور نصرت کی سند دیتے ہوئے شامی سے خطاب کر کے فرمایا کہ اس بچّے سے گفتگو کر۔

شامی نے ہشام سے کہا کہ مجھ سے ان کی امامت کے بارے میں بحث کرو۔ ہشام نے جیسے ہی یہ فقرہ سنا کانپ گئے۔ فرمایا اے شخص ذرا یہ تو بتا کہ اللہ اپنے بندوں کی مصلحت سے زیادہ واقف ہے یا خود بندے؛ اس نے کہا اللہ۔ فرمایا کہ اس مصلحت بینی سے اس نے کیا کام کیا؛ اس نے جواب دیا کہ تکلیف معین کی، اس کے بیان کے لئے حجت قائم کی! فرمایا کہ وہ حجت کیا ہے؛ اس نے کہا، حضرت رسول اکرمؐ! فرمایا ان کے بعد؛ کہنے لگا کہ کتاب و سنت! فرمایا، کیا کتاب و سنت آج ہمارے اور تیرے اختلافات کو رفع کر سکتے ہیں؛ کہنے لگا ہاں ہاں۔ فرمایا کہ پھر ہشام سے بحث کرنے کے لئے کیوں آیا ہے، یہ اختلاف کیوں نہ ختم ہو گیا؛ تیرا خیال ہے کہ دین رائے سے طے ہو سکتا ہے حالانکہ ہم اب تک اسی ایک رائے پر اتفاق نہیں کر سکے۔ یہ سن کر شامی کچھ سوچنے لگا تو حضرت صادقؑ نے فرمایا کہ اب بات کیوں نہیں کرتا؛ اس نے عرض کی کہ میں کشمکش میں ہوں۔ اگر اختلاف سے انکار کرتا ہوں تو یہ جھوٹ ہے اور اگر کتاب و سنّت کو رافع اختلاف کہتا ہوں تو یہ بھی خلافِ مشاہدہ ہے۔ خیر اب میں خود سوالات کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تو بے شک سوال کر! دیکھ کیسے کیسے جواب پاتا ہے۔ شامی نے ہشام سے وہی سوالات دہرا دیئے۔

انسان بہتر مصلحت شناس ہے یا خدا؟ فرمایا خدا۔ اس نے اپنی مصلحت بینی سے کیا کیا، اپنی حجت معین کی۔ وہ کون ہے؟ ابتدائے شریعت میں سرکار رسالتؐ اور آپ کے بعد کوئی اور وہ کوئی اور کون ہے؟ اس زمانہ میں یہی انسان کامل جو تیرے سامنے تشریف فرما ہے اور جس کی بارگاہ میں دور و دراز علاقوں سے لوگ حاضری دیتے ہیں۔

* معلّی بن خنیس۔ آپ امام صادقؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ داؤد بن علی نے آپ کو محبتِ اہلبیتؑ کے جرم میں قتل کرکے آپ کے اموال پر قبضہ کر لیا کہ وہ والیٔ مدینہ بننے کے بعد سے اس بات پر تل گیا تھا کہ طالبین کو اذیت پہنچائی جائے۔ ان کے مددگاروں پر مظالم کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ معلّی جیسے مخلص انسان ایسے ظالم کے شر سے کہاں محفوظ رہ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ امام صادقؑ کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو آپ نے نہایت درجہ غیظ و غضب کا مظاہرہ کیا اور خود داؤد کے دربار تک تشریف لے گئے۔ فرمایا، تو نے میرے چاہنے والے کو قتل کرکے اس کے اموال پر قبضہ کر لیا ہے۔ تجھے یہ معلوم نہیں کہ موت پر صبر کیا جا سکتا ہے لیکن جنگ پر خاموشی نہیں اختیار کی جا سکتی ہے۔ امام کی اس شدّت پر امیر داؤد نے چاہا کہ اس جرم کو پولیس والوں کے سر ڈال دے۔ اور اس نے ایک سپاہی کے قتل کا بھی حکم سنا دیا۔ لیکن اس نے راز کو فاش کر دیا اور اپنے قتل سے پہلے یہ اعلان کر دیا کہ لوگ دوسروں کے قتل کا حکم دیتے ہیں اور جب ان کے حکم پر عمل کیا جاتا ہے تو اطاعت گذار کے قتل کا بھی حکم سنا دیتے ہیں۔

اس حادثہ کو بعض مورخین نے سفاح کے دور میں لکھا ہے اور بعض نے منصور کے دور میں۔

اگرچہ ہم اس وقت اسی فہرست پر اکتفا کئے لیتے ہیں لیکن آئندہ کسی جلد میں عبد الملک بن اعین، زرارہ، علی بن یقطین، عمار، عمرو بن حنظلہ، فضیل بن یسار، ابوبصیر، مومن الطاق، محمد بن مسلم، معاویہ بن عمار، مفضل بن عمرو، ہشام بن سالم وغیرہ کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ درج کریں گے۔

---

# صحیح بخاری کا تنقیدی جائزہ

صحیح بخاری نے مسلمانوں کے درمیان ایسی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ اب حدیث کی کوئی کتاب بھی اس کے ہم پلہ نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی ہیبت و عظمت اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ اس کی حدیثوں پر تبصرہ کرنا بھی بدعت و بے دینی کے مرادف بن گیا ہے۔ (قواعد الحدیث ص۲۴۱)

اکثر حافظوں نے اس کی روایتوں پر تنقید کرنے سے گریز کر کے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

ذہبی نے بعض احادیث کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ عبارت تحریر کی ہے کہ "اگر صحیح بخاری کی عظمت مانع نہ ہوتی تو میں اس روایت کو جعلی کہہ دیتا۔

ابن حزم نے اس کی بعض حدیثوں کی تکذیب کا ارادہ کیا تھا، لیکن اس بات پر ان سے بڑی شدت کے ساتھ مواخذہ کیا گیا، صرف اس لئے کہ صحیح بخاری پر تنقید کرنا عمل مسلین کے خلاف ہے۔ (تہذیب التہذیب ۸ ص۱۴۶)

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اکثر حفاظ نے اس کتاب کو بلا تبصرہ نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ اس پر بھی چند وجوہ سے تنقید کی ہے جن کے اہم پہلو یہ ہیں :-

۱۔ کتاب کی ترتیب۔

۲۔ احادیث کا تجزیہ اور مختلف مقامات پر انھیں مختلف شکلوں میں نقل کرنا۔ ایک ہی

ہی حدیث کو کہیں متصل السند ذکر کرنا اور کہیں منقطع السند۔

اس سلسلے میں بعض علماء نے ایسے ایسے اعتراضات کئے ہیں کہ بخاری کے ہمنواؤں سے ان کا جواب نہیں بن پڑا ہے۔ (ضحی الاسلام ۲ ص۱۱۶)

۳۔ بخاری کی ۱۱۰ حدیثیں قابلِ تنقید ہیں جن میں سے ۳۲ حدیثیں اس کے اور مسلم کے درمیان مشترک ہیں اور ۷۸ حدیثیں تنہا بخاری نے ذکر کی ہیں۔ (مفتاح السنۃ)

۴۔ بخاری کے بعض راوی غیر معتبر ہیں جن کی تعداد تقریباً ۸۰ ہے۔

ان اعتراضات کے ہوتے ہوئے علماء کو صحیح بخاری سے ایک خاص عقیدت ہے اور وہ اس کی عظیم منزلت کے قائل ہیں۔ حد یہ ہے کہ بعض علماء نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ "بخاری قرآن کی ہمسر ہے۔ اگر زمانۂ طاعون میں اس کی تلاوت کی جائے تو وبا کا اثر نہ ہو سکے گا۔ اور اگر کسی خاص غرض سے پڑھی جائے تو مدعا حاصل ہو جائے گا۔ مصیبت میں پڑھی جائے تو نجات حاصل ہوگی اور کشتی میں پڑھی جائے تو خوفِ ہلاکت سے اطمینان و سکون نصیب ہوگا۔
(قواعد التحدیث للقاسمی ص۲۵۰)

علماء اسلام نے اسی نظریہ پر عمل بھی کیا ہے۔ ان پر جب کوئی بلا نازل ہوتی تھی تو بخاری کے اوراق پھاڑ کر طلباء پر تقسیم کر دیا کرتے تھے تاکہ سب مل کر اس کی تلاوت کریں اور بلا دفع ہو جائے۔

یہ کتاب جنگ میں ہتھیار کا کام دیتی تھی اور آگ لگنے پر فائر بریگیڈ کا۔ ہیضہ میں انجکشن کا فائدہ دیتی تھی اور گھر میں چوکیدار کا۔ غرض ہر بلا کا دفع کرنا اور ہر رحمت کا نزول اسی بخاری پر موقوف تھا۔ (قواعد التحدیث ص۲۵۱)

اس کی تقدیس و تعظیم نے اسے قرآنِ کریم کا ہمسر اور تمام کتابوں سے صحیح تر بنا دیا تھا۔ اس پر تبصرہ ناقابلِ برداشت تھا اور تبصرہ کرنے والا قابلِ ملامت تھا۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوا کہ عراق میں ترکوں کے زمانہ میں وزارتِ دفاع نے ایک عظیم رقم اس بات کے لئے مقرر کر دی کہ اس سے بخاری شریف کی تلاوت کا انتظام کیا جائے گا تو زہاوی جو اس جماعت کا ایک ممبر تھا اس نے کہا کہ یہ رقم اوقاف کی طرف سے

نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ وزارتِ دفاع میں یہ بات انتہائی لغو ہے۔ جنگ کو بخار کی ضرورت ہے بخاری کی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ممبران نے اس غریب پر حملہ کر دیا اور اس کی بات صدا بصحرا ہو گئی۔ (اخبار الرسالہ ۱۹۸۵ء صفحہ ۴۰۳)

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم حدیث پیغمبرؐ کی عظمت یا اس کی برکت سے انکار کر دیں۔ ہم تو صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ساری اہمیت صرف بخاری کے حصہ میں کیوں کر آ گئی؟ دیگر کتب احادیث کو یہ شرف کیوں نہ مل سکا؟ شفائے مریض اور دفعِ بلا کے لئے تلاوتِ قرآن پاک کو کیوں نہ اختیار کیا گیا؟ فقط صحیح بخاری ہی کو قرآن کی ہمسری کیوں نصیب ہوئی؟

مصر میں ۱۲۹۸ھ کے قحط میں ہر گھر اور ہر مسجد میں اسی کی تلاوت کیوں کی گئی؟ قرآن کریم کی ضرورت کیوں نہ محسوس ہو سکی؟

اگر بخاری کا امتیاز یہ تھا کہ اس کی حدیثیں صحیح ہیں تو یہ درجہ موطاء مالک کو بھی ملنا چاہئے تھا جسے قرآن کریم کے بعد اصح الکتب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ شرف صحیح مسلم کو بھی حاصل ہونا چاہئے تھا جسے آسمان کے نیچے سب سے زیادہ معتبر کتاب کہا گیا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ۲ صفحہ ۱۰۱) یا بقول ابن حجر بعض لوگوں نے اسے صحیح بخاری پر بھی ترجیح دی ہے کہ اس کا طرزِ بیان حسین اور بیانِ روایت معتبر ہے۔ اس میں نہ سلسلہ سند کو توڑا گیا ہے اور نہ حدیث کا ترجمہ بیان ہوا ہے۔

حاکم کا بیان ہے کہ میں نے ابو الولید کو یہ کہتے سنا ہے کہ میرے والد نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ تم اپنی تالیف کس کتاب کی بنیاد پر جمع کر رہے ہو تو میں نے عرض کی کہ بخاری کو مدرک بنایا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ مسلم کو مدرک بناؤ۔ اس میں زیادہ برکت ہے۔

اسی طرح یہ منزل صحیح ترمذی کو بھی ملنی چاہئے تھی کہ اس کی ترتیب مناسب اور اس میں صحیح و ضعیف کا امتیاز زیادہ ہے۔ اسے بخاری سے زیادہ نورانی کہا گیا ہے۔

اور اگر یہ عظمت بخاری کے مضامین کی بنا پر ہے تو قرآن اس سے زیادہ احترام کا حقدار ہے۔

اگر امام بخاری کی وجہ سے ہے تو موطاء کو زیادہ اہم ہونا چاہئے تھا کہ امام مالک علم و عمل،

شرافت، حسب ونسب کے اعتبار سے ان سے زیادہ بلند پایہ تھے۔

ہم جمال الدین حنفی کے اس فقرہ کو نہیں دہرانا چاہتے کہ "جو بخاری میں نظر کرے گا وہ کافر ہو جائے گا"۔ (شذرات الذہب، ص۲۴۰) لیکن یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ اس کی ہر حدیث پر ایمان لانا ضروری اور اس کی مخالفت کرنا تکذیب رسول اور کفر باللہ ہے یا بدعت فی الدین کے مرادف ہے۔ اس لئے کہ اس میں بہت سی حدیثیں ایسی بھی ہیں جن میں جعلی ہونے کے آثار نمایاں ہیں۔ جیسے یہ حدیث کہ رسول اکرم پر سحر کا اثر ہو گیا تھا۔ وغیرہ۔ خود علماء اعلام نے بھی اس کی روایتوں کی مخالفت کسی دلیل وبرہان کی بنیاد ہی پر کی ہے لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس تنقید کو کفر و بدعت سے تعبیر کر کے نقاد ہی کو رسول اکرمؐ کی تکذیب کرنے والا ٹھہرا دیا جائے۔

بخاری کی سو حدیثوں سے زیادہ روایتوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کے رجال پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایسے راوی تلاش کئے گئے ہیں جن کی روایت کو کسی قیمت پر صحیح نہیں کہا جا سکتا ہے۔

امام بخاری کا ایک ظلم یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہت سے علماء اعلام سے روایت نہیں لی ہے حالانکہ ان کا مرتبہ ان تمام راویوں سے بلند تر تھا جن کی روایتوں کو جگہ دی گئی ہے۔ انھیں مظلوموں کی فہرست میں سر فہرست امام صادقؑ کا نام آتا ہے جن کی کوئی روایت بخاری میں درج نہیں کی گئی ہے جب کہ ایسے افراد کی روایتیں موجود ہیں جن کا دین وایمان یا ان کی عدالت ووثاقت قابل شبہ وتشکیک ہے۔ بعض اپنے جھوٹ میں مشہور ہیں اور بعض وضع حدیث میں۔

مثلاً اسماعیل بن عبداللہ بن ادیس بن مالک المتوفی ۲۲۶ھ۔ جن کے بارے میں یحییٰ بن معین نے تصریح کر دی ہے کہ یہ جھوٹا تھا اور اہل مدینہ کے لئے روایتیں وضع کیا کرتا تھا۔

★ زیاد بن عبداللہ العامری المتوفی ۲۸۲ھ۔ جس کے بارے میں ترمذی نے وکیع سے نقل کیا ہے کہ یہ شخص جھوٹا تھا۔

★ حسن بن مدرک سدوسی۔ جسے ابوداؤد وغیرہ نے جھوٹا قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ ضعیف لوگوں کی فہرست میں ۸۰ کے قریب نام آتے ہیں جن میں حسن

بن ذکوان بصری تھا جو جعل سازی، غلط کاری اور ضعف حدیث میں۔ احمد ابن معین، نسائی، ترمذی، ابن مدینی وغیرہ کے نزدیک مشہور تھا۔

احمد بن ابی الطیب البغدادی، سلمہ بن رجاء التیمی، بسر بن آدم الضریر وغیرہ تھے۔ جن کا ضعف شہرۂ آفاق تھا۔ فاسد المذہب افراد قدری عقیدہ کے تھے اور ان کی روایتیں زینت بخاری بنی ہوئی ہیں۔

عبداللہ بن ابی لبید المدنی، عبداللہ بن ابی نجیح مکی کہمس بن منہال سدوسی، ہارون بن موسیٰ ازدی، سفیان بن سلیمان، عبدالوارث بن سعید وغیرہ۔

مختصر یہ ہے کہ امام بخاری کا کسی شخص کی حدیث کو اپنی کتاب میں جگہ دے دینا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ نہایت درجہ موثق و معتبر تھا اور اس کے بارے میں کسی تنقید کی طرف اعتنا، نہ کی جائے گی۔ امام بخاری صرف ایک شاہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جرح و تعدیل اور تنقید کا دروازہ بند کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ان پر تو یہ اعتراض بھی ہے کہ وہ راویوں کو صحیح طریقہ سے پہچانتے بھی نہ تھے۔ کبھی ایک ہی راوی کو دو تین بنا دیتے تھے اور کبھی دو تین راویوں کو ایک۔ چنانچہ ولید بن ابی الولید غلام عبداللہ بن عمر، ہارون بن سعد غلام قریش، کثیر بن خنیس وغیرہ میں ہر شخص کو دو قرار دیا ہے۔ محمد بن ایوب یمامی کو تین بتایا ہے حالانکہ وہ ایک ہی ہے۔ عبدالملک بن اخی القعقاع کی روایت قعقاع کی طرف منسوب کر دی ہے۔ باب النون میں ناسح حضرمی کا ذکر کیا ہے حالانکہ وہ عبداللہ بن ناسح ہیں جن سے شرجیل بن شفعہ روایت کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

سب سے اہم مواخذہ یہ ہے کہ بخاری نے ان افراد کی روایات کو بھی زینت کتاب بنایا ہے جن کی آلِ محمدؐ سے عداوت معروف و مشہور تھی اور جن کا خارجی یا ناصبی ہونا مسلم تھا جیسے۔

★ عمران بن حطان سدوسی المتوفی ۸۴ھ جو کھلم کھلا دشمن علیؑ تھا اور جس نے ابن ملجم کی مدح میں یہ اشعار لکھے تھے ؎

یا ضربۃ من تقی ما اراد بہا   الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا

(کیا کہنا اس متقی کی ضربت کا جس کا مقصد صرف رضائے پروردگار تھا) استغفراللہ

جو بدبخت بنصِ رسول کریمؐ اشقی الاوّلین والآخرین ابن ملجم کو متقی قرار دیتا تھا۔ (ابن حنبل، ذخائر العقبیٰ، ابو حاتم وغیرہ۔)

علماء کرام نے اس خبیث کے اشعار کا جواب نثر و نظم دونوں میں دیا ہے لیکن ہم خوفِ طوالت کی بنا پر اس کا تذکرہ نہیں کر سکتے ہیں۔

★ ابو الاحمر السائب بن فروخ المتوفیٰ ۱۳۶ھ۔ یہ شخص ہجو نگار شاعر اور دشمنیٔ اہلبیتؑ میں مشہور تھا۔ چنانچہ امیر المومنینؑ کے ایک مجاہد مخلص صحابی کی شان میں یہ اشعار نظم کئے تھے۔

لعمرك انني وابا طفيل لمختلفان والله الشهيد

لقد ضلوا بحب ابي تراب، كما ضلت عن الحق اليهود

(خدا شاہد ہے کہ ہم اور ابو طفیل ابو عامر بن واثلہ بالکل مختلف العقیدہ لوگ ہیں۔ یہ لوگ ابو تراب کی محبت میں اسی طرح گمراہ ہو گئے ہیں جس طرح یہودی گمراہ ہو گئے تھے۔) معاذ اللہ۔

اس بدبخت نے بھی رسول اکرمؐ کی مشہور و معروف حدیث "علی مع الحق"... الخ "علی مع القرآن" وغیرہ کی توہین، کی ہے۔ اور حضرت علیؑ کا اتباع کرنے والے کو یہودی سے تشبیہ دے کر گمراہ بنا دیا ہے لیکن بخاری کی نظر میں معتبر بنا رہا ہے۔

★ حریز بن عثمان الحمصی المتوفیٰ ۱۶۳ھ۔ یہ شخص دشمنیٔ علیؑ میں مشہور تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "جس علیؑ نے میرے آباء و اجداد کو قتل کیا ہے میں اسے کیوں کر دوست رکھ سکتا ہوں"۔۔۔ "تمھیں تمھارا امام علیؑ مبارک، اور مجھے معاویہ"۔

اس کے علاوہ بخاری کے رجال میں اسحاق بن سوید التیمی المتوفیٰ ۱۳۱ھ۔ عبداللہ بن سالم الاشعری المتوفیٰ ۱۷۹ھ، ابو مالک زیاد بن علاقہ الکوفی المتوفیٰ ۱۲۹ھ جیسے دشمنانِ اہلبیتؑ کا ایک سلسلہ ہے جن کی روایت کو صحیح تسلیم کرنے کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ دشمنیٔ اہلبیتؑ بنصِ رسولؐ نفاق ہے اور منافقین بحکمِ قرآن جھوٹے ہیں۔

ان حالات میں تو ہمارا علمی فرض یہ ہے کہ ہم بخاری پر تنقید کر کے اس کے ان روایات کی کھلم کھلا مخالفت کریں جن کے راوی ایسے دشمنانِ اہلبیتؑ ہوں۔ میں نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ

دشمنی اہلبیتؑ کو نفاق قرار دینے والی روایتیں بخاری کی نظر سے کیوں کر مخفی ہوگئی تھیں جب کہ اس دور میں منافقین کی شناخت ہی یہ تھی کہ وہ اہلبیتؑ رسولؐ سے عداوت رکھتے تھے۔

بخاری کو وہ روایتیں کیوں کر نہ مل سکیں جن میں علیؑ کی صلح و جنگ کو نبیؐ کی صلح و جنگ قرار دیا گیا تھا، اور انھیں حضرت ہارون کا مرتبہ دیا گیا تھا۔ جب کہ خود انھوں نے روایت کو ص۱۹۹ پر نقل کیا ہے۔

اس کے علاوہ فضائل اہلبیتؑ کی ہزار حدیثیں علماء کرام اور حفاظِ احادیث نے نقل کی ہیں لیکن بخاری نے ان میں سے صرف ۳۔۴ کا انتخاب کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان ۳۔۴ کے علاوہ باقی سب روایتیں غلط ہیں۔ یا بخاری کے انتخاب کی پشت پر کوئی اور جذبہ کام کر رہا ہے جیسا کہ بعض اہلِ قلم نے فرمایا ہے کہ بخاری کی کتاب میں مسند احمد جیسی جرأت و شجاعت نہیں ہے۔ مسند میں عباسیوں کے خوف کے باوجود فضائلِ علیؑ کی روایتیں ہیں لیکن بخاری میں یہ ہمت مفقود ہے۔

اس دعویٰ کی وضاحت کے لئے چند ایسی حدیثوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھیں تمام اہلِ حدیث نے نقل کیا ہے لیکن بخاری نے اپنی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی ہے۔

## آیۂ تطہیر

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝

(اے اہلبیتؑ اللہ کا ارادہ تم سے رجس کے دور رکھنے اور تمھاری کامل تطہیر سے متعلق ہو چکا ہے۔)

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضور اکرمؐ بیت الشرف سے سیاہ بالوں کی چادر اوڑھ کر برآمد ہوئے۔ اتنے میں حسنؑ آگئے آپ نے انھیں داخل ردا کر لیا۔ حسینؑ آگئے انھیں بھی ساتھ لے لیا۔ فاطمہ آگئیں انھیں بھی شامل کر لیا اور علیؑ آئے تو انھیں بھی ہمراہ لے

لیا اور فرمایا انما یرید اللہ ... الخ (صحیح مسلم ۲ ص ۱۲۷)

صحیح ترمذی میں عمرو بن ابی سلمہ (پروردۂ رسولؐ) سے روایت ہے کہ یہ آیت ام سلمہ کے گھر میں نازل ہوئی ہے۔ جب آپ نے فاطمہؑ، حسنینؑ اور علیؑ کو طلب کر کے داخلِ کساء کر کے یہ دعا کی تھی کہ خداوندا یہ میرے اہلبیتؑ ہیں ان سے ہر رجس الگ رہے اور یہ کما حقہٗ پاک و پاکیزہ رہیں۔ جس پر ام سلمہ نے بھی داخلہ کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو تم خیر پر ہو۔ (ترمذی ۱ ص ۲۰۴)

احمد بن شعیب نسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے خصائص کے ص ۴ پر سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے کہ آیتِ تطہیر کے نزول کے وقت آنحضرتؐ نے علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ کو جمع کر کے یہ دعا کی تھی "اللھم ھؤلاء اھل بیتی" "خداوندا یہ سب میرے اہلبیتؑ ہیں"۔

خطیب نے ابو سعید کے طریق سے ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت گھر میں صرف علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ تھے۔ میں دروازہ پر تھی۔ میں نے بڑھ کر سوال کیا۔ یا رسولؐ اللہ میری منزل کہاں ہے؟ تو آپ نے فرمایا تمہارا انجام بخیر ہے۔ (الخطیب ج ۹ ص ۱۲۷)

دوسری روایت میں اس انداز سے نقل ہوا ہے کہ وقتِ نزول آیت آنحضرتؐ نے سب کو جمع کر کے یہ دعا کی کہ خداوندا یہ سب میرے اہلبیتؑ ہیں۔

ابن عبد البر نے استیعاب ۲ ص ۲۷ (حاشیہ اصابہ) میں نقل کیا ہے کہ وقتِ نزولِ آیت حضرت ام سلمہ کے گھر میں علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کو جمع کر کے یہ دعا کی "خداوندا یہ میرے اہلبیتؑ ہیں انھیں پاک و پاکیزہ رکھنا"۔ اسی روایت کو ابن اثیر نے اسد الغابہ ۵ ص ۵۲۱ پر نقل کیا ہے۔

تفسیر طبری میں ابو سعید خدری سے نقل ہوا ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا "یہ آیت میرے، علیؑ و فاطمہؑ اور حسنینؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے"۔

دوسری روایت ام سلمہ سے نقل ہوئی ہے کہ یہ آیت انھیں کے گھر میں نازل ہوئی ہے جب کہ گھر میں خمسہ نجباءؑ تھے اور بس۔

ابو سعید خدری نے ام سلمہ کے ذریعہ نقل کیا ہے کہ حضرت نے دعا فرمائی۔ خداوندا یہ

میرے اہلبیتؑ ہیں ان سے ہر رجس کو دور رکھنا اور انھیں پاک و پاکیزہ رکھنا۔ (تفسیر طبری ۲۲ صـ)

جناب ام سلمہ ہی سے ابوہریرہ اور شہر بن حوشب کے طریق سے بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ (تفسیر طبری)

واثلہ بن اسقف کے ذریعہ حضرت علیؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت رسولؐ، فاطمہؑ، حسنینؑ اور میرے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

انس بن مالک اور ابوالحمراء سے نقل ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نزولِ آیت کے بعد چھ مہینہ تک درِ فاطمہؑ پر آکر آواز دیتے تھے الصّلوٰۃ اھل البیت انما یرید اللّٰہ ... الخ (تفسیر طبری)

سیوطی نے درمنثورہ صـ ۱۹۸ پر نقل کیا ہے کہ ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتمؒ اور ابن مردویہ نے ام سلمہ سے یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت ان کے گھر میں خیبری چادر اوڑھے ہوئے آرام فرما رہے تھے کہ اتنے میں فاطمہؑ آگئیں۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ علیؑ و حسنینؑ کو بلاؤ۔ انھوں نے سب کو بلایا۔ ابھی تمام حضرات مشغولِ طعام تھے کہ آیت نازل ہوئی انما یرید اللّٰہ ... الخ حضرت نے اپنی چادر تمام افراد پر اوڑھا دی۔ اور چادر سے ہاتھ نکال کر یہ دعا کی۔ خداوندا! یہ میرے اہلبیتؑ اور مخصوص افراد ہیں۔

محمد بن احمد مالکی نے فصول المہمہ کے صـ ۶ پر نقل کیا ہے کہ واحدی نے اپنی کتاب "اسباب النزول" میں ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ان کے گھر میں تھے۔ اتنے میں فاطمہؑ آگئیں۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے شوہر اور حسنؑ و حسینؑ کو طلب کرو۔ انھوں نے سب کو بلایا اور سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔ میں قریب کے حجرہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آپ نے ایک چادر سب پر ڈال دی اور یہ دعا کی۔ خداوندا! یہ سب میرے اہلبیتؑ ہیں، ان سے رجس کو دور رکھنا اور انھیں کما حقہٗ پاک رکھنا۔ میں نے بھی سر ڈال کر عرض کی۔ یارسول اللہ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں۔

فرمایا تم خیر پر رہو۔ اتنے میں آیت نازل ہو گئی۔ انما یرید اللّٰہ ... الخ

محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ صفحہ ۲۱ پر اس قصہ کو نقل کیا ہے جس کی روایت ام سلمہ، عمرو بن ابی سلمہ، زینب بنت ابی سلمہ اور واثلہ بن اسقع وغیرہ نے کی ہے۔ (ذخائر العقبیٰ صفحہ ۲۴)
احمد نے مناقب میں اور طبرانی نے ابوسعید خدری سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت رسول اکرم حضرت علیؑ، فاطمہؑ اور حسنینؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔
خطیب بغدادی نے ۹ صفحہ ۲۹ پر سعد بن ابی عوف اور ابوسعید کے واسطہ سے ام سلمہ سے اور ۱۰ صفحہ ۲۷۸ پر ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ یہ آیت خمسہ نجبا کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ یہی روایت بغوی نے عائشہ سے نقل کی ہے۔ (معالم التنزیل)
حاکم نے مستدرک میں عطار بن یسار کے واسطے سے ام سلمہ سے یہی روایت بیان کی ہے۔ (مستدرک ۲ صفحہ ۴۱۶)
عبدالملک ثعلبی النیشاپوری نے نقل کیا ہے کہ حضرت نے علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کو جمع کر کے آیتِ تطہیر سنائی تو جبریل نے بھی تقرب کی غرض سے اس چادر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ (ثمار القلوب صفحہ ۴۸۴)
اسی کتاب کے صفحہ ۴۸۳ پر ہے کہ اہلبیتؑ کا لقب آلِ کسا بھی ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

والخمسة الغرا صحاب الكساء معًا
خير البرية من عجم ومن عرب

(یہ اصحابِ کسا خمسہ نجبا تمام عرب و عجم سے افضل و برتر ہیں۔)
ابن تیمیہ سے پوچھا گیا کہ کیا حضرت علیؑ بھی اصحاب کسا میں داخل ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ آپ اہلبیتؑ میں سب سے افضل و برتر ہیں۔ آنحضرتؐ نے علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کو جمع کر کے یہ دعا کی تھی کہ خداوندا! یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔ ان سے رجس کو دور رکھنا اور انھیں کما حقہ، پاک و پاکیزہ رکھنا۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ۱ صفحہ ۲۳۰)
ابن حجر مکی نے بوصیری کے قصیدہ ہمزیہ کی شرح کے صفحہ ۳۱۹ پر اس شعر کی تفسیر کرتے ہوئے (وبأم السبطين زوج علي۔ وبنيها ومن حوته العباء) (زوجہ علیؑ مادر سبطینؑ کا واسطہ اور ان کی اولاد

اور ان سب کا واسطہ جو زیر عبا تھے) لکھا ہے کہ ان حضرات سے مراد پیغمبر اکرمؐ، حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ اور حسنینؑ تھے۔ اس لئے کہ روایتِ صحیحہ کی بنا پر رسول اکرمؐ نے علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کو چادر میں لے کر دعا کی تھی کہ خداوندا یہ میرے مخصوص اہلبیتؑ ہیں۔ انھیں پاک و پاکیزہ رکھنا۔

ام سلمہ نے بھی عرض کی کہ یا رسولؐ اللہ میں بھی انھیں میں سے ہوں؟ تو آپ نے فرمایا کہ تم خیر پر ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ ان سب پر چادر ڈال کر دعا کی کہ خداوندا یہ آلِ محمدؐ ہیں ان پر اپنی برکت و رحمت نازل کرنا کہ تو بڑا حمید و مجید ہے۔

شیخ عبد القادر رافعی نے نیل المراد ص۶۵ میں نقل کیا ہے کہ بوصیری کے اس شعر سے مراد خمسہ نجباء ہیں۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے خمسۂ نجباء کے بارے میں نزول کا تذکرہ پندرہ مقامات پر کیا ہے جن کا خاکہ یہ ہے۔

۱۔ ابو الحمراء کی روایت ہے کہ آنحضرت روزانہ صبح کے وقت علیؑ و فاطمہؑ کے دروازہ پر آکر فرماتے تھے الصلوٰۃ یا اھل البیت انما یرید اللہ ... الخ

۲۔ شداد بن عمار کہتے ہیں کہ میں واثلہ بن اسقف کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں علیؑ کا ذکر آگیا اور لوگوں نے سب و شتم شروع کر دیا۔ مجلس برخاست ہوئی تو واصلہ نے کہا کہ آؤ میں تمھیں اس شخص کے بارے میں بتاؤں جس کی مذمت ہو رہی تھی۔ میں حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کو زیر کسا رلے کر یہ دعا کی "خداوندا یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔ ان سے ہر رجس کو دور کر دے اور انھیں کما حقہٗ پاک و پاکیزہ رکھ۔"

۳۔ ابی ریاح کی حدیث ام سلمہ سے ہے جس میں آپ نے خمسۂ نجباء کی شان میں نازل ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

۴۔ ابو ہریرہ کی حدیث ام سلمہ سے۔

۵۔ حکم بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے ام سلمہ کے سامنے علیؑ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ آیتِ تطہیر میرے گھر میں نازل ہوئی ہے۔

۶۔ عطیہ کی روایت اپنے باپ کے واسطہ سے ام سلمہ سے۔
۷۔ شہر بن حوشب کے واسطہ سے ام سلمہ سے روایت۔
۸۔ عمرو بن ابی سلمہ کے واسطہ سے ام سلمہ سے۔
۹۔ ابوسعید کے واسطہ سے ام سلمہ سے۔
۱۰۔ صفیہ بنت شیبہ کے واسطہ سے ام المومنین عائشہ سے نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ سیاہ چادر اوڑھ کر باہر نکلے۔ اتنے میں بالترتیب حسنؑ وحسینؑ وفاطمہؑ وعلیؑ آگئے۔ آپ نے سب کو زیر کساء لے کر آیۂ تطہیر کی تلاوت کی۔
۱۱۔ عوام بن حوشب نے اپنے ابن عم سے نقل کیا ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ حضرت عائشہ کے پاس حاضر ہوا اور ان سے علیؑ کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ سے زوج بتول اور احب الناس الی الرسول کے بارے میں سوال کرتے ہو؟ میں نے وہ موقع بھی دیکھا ہے جب آنحضرتؐ نے علیؑ وفاطمہؑ وحسنینؑ کو زیر کساء لے کر یہ دعا کی تھی اللّٰھم ھٰؤلاء اھل بیتی ... الخ اور جب میں نے داخلہ کی کوشش کی تو حضرت نے فرمایا تھا کہ تم دور رہو، تم خیر پر ہو۔ (یہ روایت معالم التنزیل ص۲۱۳ پر نقل ہوئی ہے جس میں آخر میں انت من ازواج النبی کا فقرہ بڑھایا گیا ہے اور اس مقام پر انک علیٰ خیر کا اضافہ ہوا ہے لیکن مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اس کا ذکر عام طور پر ام سلمہ کے حالات میں ملتا ہے۔)
۱۲۔ ابوسعید خدری نے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت میرے اور علیؑ وفاطمہؑ وحسنینؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔
۱۳۔ عامر بن سعد نے سعد سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے سب کو زیر کساء لے کر دعا کی تھی کہ خدایا یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔
۱۴۔ ابی جمیلہ کے واسطے سے امام حسنؑ بن علیؑ سے روایت ہوئی ہے۔
۱۵۔ سدی اور ابی دیلم کے واسطے سے امام علیؑ بن الحسینؑ سے روایت ہوئی ہے۔

ابن کثیر کے یہ بیانات ایک انصاف پسند ذہن کے لئے بہت کافی ہیں۔ ان کی روشنی

میں آیۂ تطہیر کا خمسۂ نجباء سے مخصوص ہونا اظہر من الشمس ہے۔

حضور اکرمؐ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ اکثر اوقات جناب فاطمہ کے دروازے سے گذرتے ہوئے اس آیت کی تلاوت کر دیا کرتے تھے تاکہ اصحاب کی نظر میں اہلبیت کرام کی یہ منزل روشن رہے اور آیندہ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو سکے۔ چنانچہ :-

★ صحیح ترمذی میں انس بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت چھ ماہ تک ہر نمازِ صبح کے وقت بابِ فاطمہؑ سے گذرتے تھے اور الصّلوٰۃ اھل البیت کہہ کر آیتِ تطہیر کی تلاوت فرماتے تھے۔ (شرح ترمذی ۱۲ ص۸۵، استیعاب (حاشیہ اصابہ) ۴ ص۴۶)

★ ابوالحمراء کی روایت میں "السّلام علیکم اھل البیت" وارد ہوا ہے۔

★ سیوطی نے درِ منثور ۵ ص۱۹۹ پر تحریر کیا ہے کہ یہ واقعہ آٹھ مہینہ تک پیش آتا رہا اور آنحضرتؐ ہر نمازِ صبح کے وقت السّلام علیکم اھل البیت کہہ کر آیت کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

★ اسد الغابہ میں یہ روایت ابوالحمراء کے حالات کے ذیل میں ج ۵ ص۱۷۴ پر نقل ہوئی ہے۔

★ ابن عباس کا کہنا ہے کہ آنحضرت نو مہینہ تک حضرت علیؑ کے دروازے پر ہر نماز کے وقت السّلام علیکم اھل البیت انما یرید اللہ ... الخ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس طرزِ عمل سے آنحضرتؐ کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ صبح کے وقت اہلبیتؑ کو نماز کے لئے بیدار کریں۔ اس لئے کہ ان حضرات کی تمام رات یوں ہی عبادتِ الٰہی میں بسر ہوتی تھی۔ ان کا کوئی لمحہ ذکرِ خدا سے خالی نہیں رہتا تھا۔ آپ کا مقصد صرف یہ تھا کہ امت کو ان حضرات کی منزل سے آگاہ کر دیں اور یہ سمجھا دیں کہ آیۂ تطہیر کے صحیح مصداق یہی لوگ ہیں اور بس!

علامہ شیخ عبدالمجید شرنوبی ازہری فرماتے ہیں کہ لفظ آل کے معنی موارد کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ حکم زکوٰۃ میں آل سے وہ تمام حضرات مراد ہیں جن پر صدقہ حرام ہے یعنی بنی ہاشم۔ لیکن مدح و ثنا کی منزل میں صرف وہی حضرات مراد ہوں گے جن کی محبت اور زیارت سے

مقاصد بر آتے ہیں جن کی محبت پر مرنے والا مرحوم ہوتا ہے اور جن کے بارے میں شاعر نے خوب کہا ہے ؎

اری حب آل البیت عندی فریضہ
علی رغم اھل البعد یورثنی القربیٰ

(میری نظر میں محبت اہلبیتؑ ایک فریضہ ہے جو دشمنوں کے علی الرغم تقرب پیدا کراتی ہے۔)

فما اختار خیر الخلق منا جزائہ
علیٰ ھدیہ الا المودۃ فی القربیٰ

(اس لئے کہ سرکارِ دو عالمؐ نے اپنی ہدایت کی کوئی جزا سوائے محبّت اہلبیتؑ کے نہیں پسند کی ہے۔)

یہی وہ اہلِ عبا ہیں جنھیں آنحضرت نے زیرِ کساء جمع کر کے دعا کی تھی۔ خدایا یہ میرے اہلبیتؑ ہیں۔ ان سے رجس کو دور کر کے انھیں کما حقہٗ پاک و پاکیزہ رکھنا۔ جس کے بعد آیتِ تطہیر نازل ہوئی تھی۔ یہ علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ ہیں جیساکہ شاعر نے کہا ہے ؎

ان النبی محمداً و وصیہ وابنیہ وابنتہ البتول الطاھرۃ
اھل العباء وانّنی بولائھم ارجو السّلامۃ والنجا فی الآخرۃ

(محمدؐ و علیؑ و بتولؑ و حسنینؑ یہی وہ اہلِ عبا ہیں جن کی محبّت سے آخرت میں سلامتی اور نجات کی امید وابستہ ہے۔)

★ شیخ عبداللہ شبراوی نے الاتحاف السنیہ ص۵ میں۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ کے ۴ ص۲۰۴ پر، محمد بن یوسف شافعی نے کفایۃ الطالب ۲ ص۱۳ میں اور شیخ ابوبکر بن ملا حنفی نے قرۃ العیون ۱ ص۱۸۹ پر یہی روایت نقل کی ہے۔

★ ابن عبدربہ نے اسے عقد فرید ۱ ص۳۷ پر نقل کیا ہے۔

★ شیخ نعمان آلوسی نے غالیۃ المواعظ ۲ ص۸۶ پر ابوسعید خدری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے جیساکہ بیہقی، ترمذی، ابن المنذر

وغیرہ نے ام سلمہ سے روایت کی ہے۔

★ واحدی نے اسباب النزول ص۲۶۷ پر ابوسعید کے واسطہ سے ام سلمہ سے روایت کی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مختصر فہرست سے ہمارا مدعا روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے جس کے بعد مزید کسی تفصیل کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔ ورنہ اگر ہم تمام حوالے درج کر کے ان پر تبصرہ کرنا شروع کر دیں تو ایک کتاب چند جلدوں کی شکل میں تبدیل ہو جائے گی۔

## ۲۔ حدیثِ غدیر

یہ وہ حدیث ہے جسے سو سے زیادہ اصحاب کرام نے روایت کیا ہے جن میں یہ جلیل القدر اور عظیم المرتبت صحابہ بھی شامل ہیں۔

★ ابوذر غفاری المتوفی ۳۱ھ۔ جن کے بارے میں رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ بالائے زمین اور زیر آسمان ابوذر سے زیادہ صادق القول کوئی نہیں ہے۔ (جیسا کہ اکثر محدثین نے بیان کیا ہے۔)

★ حذیفہ الیمانی المتوفی ۲۹ھ

★ البراء بن عازب

★ جابر بن عبد اللہ انصاری

★ ابو ایوب خالد بن زید انصاری المتوفی ۵۰ھ

★ سعد بن ابی وقاص

★ سلمان فارسی المتوفی ۳۶ھ

★ طلحہ بن عبید التیمی

★ حضرت عائشہ (آپ کی روایت کو ابن عقدہ نے اپنی کتاب حدیث الولایہ میں درج کیا ہے اور ابن عقدہ وہ بزرگ ہیں جن کے حافظہ پر تمام مورخین کا اجماع ہے۔ اکثر لوگوں نے تو ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں ایک لاکھ حدیثیں مع سند کے حفظ کئے ہوئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

★ [illegible]

★ [illegible]

★ [illegible]

★ [illegible]

★ [illegible]

[illegible]

میں زید بن ارقم سے نقل کیا ہے کہ جب آنحضرت حجۃ الوداع سے واپسی کے مواقع پر دوپہر کے وقت مقام غدیر خم میں اترے تو آپ نے اسی شدید دھوپ میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔

"اللہ نے مجھ پر بلّغ ما انزل الیك کی آیت نازل کی ہے اور جبریل نے یہ کہا ہے کہ اسی مقام پر ٹھہر کر ہر سفید و سیاہ کو یہ بتا دوں کہ علیؑ بن ابی طالب میرے بھائی، وصی، خلیفہ اور میرے بعد امام ہیں۔ میں نے جبریل سے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ چاہنے والوں کی تعداد کم اور اذیت رساں عناصر زیادہ ہیں۔ لوگ مجھے محبتِ علیؑ میں بدنام کر کے اذن سے تعبیر کر رہے ہیں میں ان کے نام بھی بتا سکتا ہوں لیکن عیب پوشی کو علامت بزرگی سمجھتا ہوں۔ لیکن بہرحال تم لوگوں کو یہ اطلاع دیئے دیتا ہوں کہ اللہ نے علیؑ کو تمہارے لئے ولی و امام مقرر کر دیا ہے۔ اب ہر شخص پر ان کی اطاعت فرض ہے۔ ان کا حکم نافذ اور ان کا قول حتمی ہے۔ ان کا مخالف ملعون اور ان کا ہمنوا قابلِ رحمت ہے۔ تم سب علیؑ کی اطاعت کرو اس لئے کہ اللہ تمہارا حاکم ہے اور وہ تمہارے امام ہیں۔ ان کے بعد امامت کا سلسلہ انہیں کی نسل میں رہے گا۔

کتابِ خدا کو سمجھو۔ متشابہات کے چکر میں نہ پڑو۔ اس کا علم اسی کے ذریعہ تم تک پہنچے گا۔ جس کے بازو میرے ہاتھوں میں ہیں اور جسے میں بلند کر رہا ہو۔ یاد رکھو جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔ یہ آیت اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے جسے میں نے یہ حکم پہنچا کر تم کو سنا دیا ہے۔ میرا بیان بالکل واضح ہے۔"

یہی وہ باعظمت حدیث ہے جسے امام بخاری نے ترک کر کے دیگر روایات فضائل آل محمدؐ کی طرح اس کے نقل سے گریز کیا ہے حالانکہ غدیر کا واقعہ اسلامی تاریخ کے تمام واقعات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کا انکار ایک معمولی تاریخ دان کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض مسلمانوں نے واقعہ کے تمام اہم پہلوؤں سے قطع نظر کر کے اصل واقعہ ہی کو جھٹلانا چاہا ہے اور ان کی نظر میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر جیسا اجتماع، کڑی

دھوپ، تپتا صحرا، مدنی، مصری، عراقی، مسلمانوں کا ایک لاکھ کا مجمع نہ سما سکا۔ رسول اکرمؐ کو یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ میری امت اس پیغام کو قبول نہ کر سکے گی۔ اس لئے کہ ہر شخص کا درجۂ ایمان و یقین برابر نہیں ہوتا ہے۔ ہر شخص نبیؐ کو خواہشاتِ دنیا اور مادّی اغراض سے بری نہیں جانتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود پروردگار نے انھیں اس حکم سے معاف نہیں رکھا بلکہ تند لہجہ کے ساتھ حکم دیا کہ میرے اس پیغام کو پہنچایا جائے۔ آنحضرتؐ نے حکم کی تبلیغ کی اور مسلمانوں سے اپنے اولیٰ بالتصرف ہونے کا اقرار لیا اور جب سب نے اعتراف کر لیا تو یہ اعلان کیا کہ "جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔" اس کے بعد وقتاً فوقتاً اشارۃً یا صراحتاً اس مطلب کی تاکید کرتے رہے تاکہ حجت تمام ہو جائے اور عذر کا موقع نہ رہے۔

اب اسے کیا کیا جائے کہ علماء اسلام نے ان تمام خصوصیات کے باوجود حدیث کی تاویل شروع کر دی اور روزانہ ایک نیا مفہوم ایجاد کرنے لگے۔ سچ کہا گیا ہے ؏

بات میں بات نکل آتی ہے

**عیدِ غدیر:** اسلام کی ایک ایسی اہم تقریب ہے جسے محبانِ اہلبیتؑ نے ہر دور میں مختلف طریقوں سے منایا ہے۔

آل بویہ کے دور میں بغداد میں یہ عید علی الاعلان منائی جاتی تھی لیکن یہ طرزِ مسرت دشمنوں کی نظر میں کھٹک رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی اور طرفین سے عظیم اختلافات رونما ہوئے لیکن چاہنے والوں نے اس سلسلہ کو ختم نہ ہونے دیا اور مختلف شکلوں میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے رہے۔

دشمنانِ تشیع نے یہ طے کر لیا کہ اس قسم کی مخالفتیں شیعوں کو ان کے مذہبی شعار سے نہیں روک سکتیں۔ لہذا مخالفت کا ایک اور طریقہ ایجاد کیا اور عیدِ غدیر کے مقابلہ میں عیدِ غار کی بنیاد ڈال دی جس میں ۲۶ ذی الحجہ کو ایک قبہ بنایا جاتا تھا تاکہ یہ ظاہر کیا جائے کہ رسول کریمؐ ابوبکر کے ساتھ غار میں مخفی ہو گئے ہیں۔

ان مساکین نے اس بات پر بھی توجہ نہ دی کہ غار کا واقعہ آخرِ صفر یا ابتدائے ربیع الاوّل کا ہے۔ ۲۶ ذی الحجہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ (شذرات الذہب ابن عماد ۳ ص ۱۳۰)

ایک عرصہ تک یہ مصنوعی عید قائم رہی اور اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا کہ کاغذ کی ناؤ ہمیشہ نہیں چلتی ہے۔ لیکن محبانِ اہلبیتؑ روزِ اوّل سے آج تک غدیر کی مسرت اور محرم کے غم کے پابند ہیں۔

دشمنانِ تشیع نے اس اندازِ مقابلہ میں بھی شکست کھائی تو ۳٦۳ھ میں ایک اور نیا طریقہ اختیار کیا کہ ایک عورت کو عائشہ کا نام دے کر طلحہ و زبیر نام کے افراد منتخب کر کے جمل کی یادگار منانے لگے۔ ان کا نعرہ یہ ہوتا تھا کہ ہم علیؑ سے جنگ کرنے جا رہے ہیں جس کے نتیجہ میں طرفین میں مقابلہ ہوا اور ایک بڑی جماعت کا قتل رونما ہو گیا۔ (تاریخ ابن کثیر ۱۱ ص ۲۲۵)

غدیر و محرم کی وجہ سے طرفین میں یہ اختلاف باقی رہا، یہاں تک کہ دشمنوں نے سودانیوں اور سپاہیوں سے مدد طلب کی اور ۳۵۰ھ میں ایک عام رواج یہ ہو گیا کہ حکومتی سپاہی لوگوں سے پوچھتے تھے کہ تمہارا ماموں کون ہے؟ اگر اس نے جواب میں معاویہ کا نام لے لیا تو خیر ورنہ ...

اس دور میں مصر کا عام دستور یہ تھا کہ جب شیعوں سے لڑائی مقصود ہوتی تو معاویہ کو حضرت علیؑ کا ماموں کہہ کر جلوس نکال دیا جاتا چنانچہ طرفین میں تصادم ہوا اور اس کے فاسد اثرات ظہور پذیر ہوئے۔

اس سلسلہ کا ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ ایک شیعہ سے یہ کہا گیا کہ معاویہ تمہارا ماموں ہے تو اس نے برجستہ جواب دیا کہ مجھے علم نہیں ہے شاید میری ماں نصرانی رہی ہو۔

ظاہر ہے کہ دشمنوں کے یہ تمام اقدامات صرف اس بنیاد پر تھے کہ اس طرح عیدِ غدیر کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے لیکن کیا کہنا ان محبت کے متوالوں کا کہ تمام مصائب و مظالم کا سامنا کرتے رہے لیکن اپنے دینی شعار کے مظاہرہ سے باز نہ آئے۔ (الحضارۃ الاسلامیہ للاستاذ آدم متز ۱ ص ۱۰۳)

عاشور کے سوگ کو مٹانے کے لئے یہ تدبیر ایجاد ہوئی کہ مصعب بن زبیر کے روزِ قتل کی یادگار منائی جائے، ان پر نوحہ و ماتم کیا جائے۔ اس لئے کہ انھوں نے بھی امام حسینؑ کی طرح صبر و استقلال سے جہاد کیا ہے اور قتل ہوئے ہیں۔ ان کے باپ بھی سرکارِ رسالت کے پھوپھی زاد بھائی اور ان کے حواریین میں سے تھے۔ صرف امام حسینؑ کے پدر بزرگوار ہی آپ کے ابن عم

اور اسلام کے واحد سپاہی نہ تھے۔ معاذاللہ (شذرات الذہب ۳ صفحہ ۱۳۰)
اس سلسلے میں بغداد کے وہ خونیں حادثات آج بھی تاریخ میں ثبت ہیں جن کے ظہور کی تمام تر ذمہ داریاں تعصب و جہالت کے سر ہیں جن سے کرخ کا سانحۂ عظمیٰ ظہور پذیر ہوا۔ وہ عظیم حادثہ جس میں شیعوں کے گھروں میں آگ لگائی گئی۔ ان کے مردوں کو قتل کیا گیا۔ ان کے بچوں کو بے دردی کے ساتھ تہِ تیغ کیا گیا اور آخر کار ظالمین بھی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔
ہم ان قدیم حادثات کو صرف اس لئے نہیں دہرانا چاہتے ہیں کہ اتحاد بین المسلمین کی قربانگاہ پر ہماری یہ قربانیاں بھی پیش پیش رہیں اور مسلمان یہ احساس کریں کہ باہمی برادری اور اخوت کے لئے ہم نے کس کس صبر و ضبط کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ کیسے کیسے تلخ گھونٹ نہیں پئے۔ ہم اب بھی تاریخ اسلام سے تقاضا کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مظالم سے قطع نظر کرکے ہماری طرف محبت اور برادری کا ہاتھ بڑھائے جس طرح ان مصائب کو برداشت کرنے کے بعد بھی ہم بڑھا رہے ہیں۔ ہماری نظر میں اسلامی اخوت کی قدر و قیمت ہے۔ ہم عالم اسلام کو صرف ایک نقطہ پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

## ۳۔ حدیث ثقلین

صحیح مسلم ج ۲، صفحہ ۱۲۲ پر زید بن ارقم کے واسطہ سے سرکار رسالتؐ کا وہ تاریخی خطبۂ غدیر نقل ہوا ہے جس میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا "انا تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ فیہ الھدیٰ والنور فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ" "واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی"۔
ترمذی نے جلد ۲ صفحہ ۳۰۸ پر زید بن ارقم ہی کے واسطہ سے یہ ارشاد نقل کیا ہے "انا تارک فیکم الثقلین ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی احدھما اعظم من الآخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض وعترتی اھل بیتی ولن یفترقا حتیٰ یردا علیّ الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھما" میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتابِ خدا جس کا سلسلہ زمین سے آسمان تک ہے اور ایک میری عترت

اہلبیتؑ یہ دونوں حوضِ کوثر تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ ان دونوں سے تمسک نجات کا ضامن ہے۔ ان میں ایک دوسرے سے عظیم تر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم میرے بعد ان سے کیا سلوک کرتے ہو؟)

* احمد بن حنبل نے اپنی مسند ۲ صفحہ ۱۱۴ میں ابی سعید خدری سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی وانھما لن یفترقا حتیٰ یردا علی الحوض۔

* صفحہ ۱۷ پر انھیں ابوسعید سے دوسری روایت نقل ہوئی ہے" انی اوشك ان ادعیٰ فاجیب وانی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی کتاب اللہ حبل ممدود من السمآء الی الارض وعترتی اھل بیتی وان اللطیف الخبیر اخبرنی انھما لن یفترقا حتیٰ یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھما" (میں عنقریب دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک کتابِ خدا اور ایک میری عترت اہلبیتؑ۔ کتابِ خدا زمین سے آسمان تک کھینچی ہوئی ریسمانِ ہدایت ہے اور عترت میرے اہلبیتؑ ہیں۔ خدائے خبیر نے مجھے اطلاع دی ہے کہ یہ دونوں حوضِ کوثر تک جدا نہ ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟)

یہی روایت صفحہ ۲۶ پر بھی درج ہوئی ہے۔

* بغوی نے مصابیح السنۃ کے ۲ صفحہ ۲۰۵ پر اور قاضی عیاض نے اپنی کتاب شفاء میں یہی روایت نقل کی ہے۔

* خطیب بغدادی نے ۸ صفحہ ۴۴۳ پر حذیفہ بن اسید سے رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے" یا ایھا الناس انی فرط لکم وانتم واردون علی الحوض وانی سائلکم حین تردون علی الحوض عن الثقلین فانظروا کیف تخلفونی فیھما الثقل الاکبر کتاب اللہ سبب طرفہ بید اللہ وطرفہ بایدیکم فاستمسکوا بہ" (ایھا النّاس! میں دنیا سے جا رہا ہوں اور تمھیں میرے پاس کوثر پر آنا ہے۔ میں تم سے ان

وقت ثقلین کے بارے میں مواخذہ کروں گا لیکن میرے بعد ان سے ہشیار رہنا۔ ان میں ثقل اکبر کتاب خدا ہے جو ایک ریسمانِ ہدایت ہے جس کا ایک سرا پروردگار سے ملا ہوا ہے اور ایک تمھارے ہاتھ میں ہے۔

* حاکم نے مستدرک ج ۳ ص ۱۰۹ پر زید بن ارقم سے اور سیوطی نے زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابن سعید خدری تین اصحاب سے یہی روایت نقل کی ہے۔
* فقیہ الحرمین محمد بن یوسف شافعی نے کفایۃ الطالب میں اور طبری نے ذخائر العقبیٰ میں اس روایت کو زید بن ارقم سے نقل کیا ہے۔
* ابن حجر نے صواعق محرقہ ص ۱۳۶ پر روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے بیس سے زیادہ اسناد ہیں۔
* عبداللہ بن محمد الشبراوی نے کتاب الاتحاف اور سیوطی نے کتاب احیاء المیت[1] میں اس کا ذکر کیا ہے، جو اتحاف کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔

شیخ عدوی نے مشارق الانوار کے ص ۱۴۶ پر اور علامہ ابو البرکات نعمان آفندی آلوسی نے غالیۃ المواعظ کے ۲ ص ۸۵ پر اسے ذکر کیا ہے۔

* ابن حجر نے قصیدۂ ہمزیہ کی شرح کرتے ہوئے اہلبیتؑ کے فضائل یوں بیان کیے ہیں: "حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ مجھ پر ایمان اسی وقت تمام ہوگا جب میری محبت ہو اور میری محبت اسی وقت ہوگی جب میرے اقرباء سے الفت ہو۔ میں ان کے دوست کا دوست اور ان کے دشمن یا ان سے جنگ کرنے والے کا دشمن ہوں۔ جس نے انھیں اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے خدا کو اذیت پہنچائی ـــــ اس کے بعد حدیث ثقلین کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس سے مراد آل محمدؐ ہیں۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے ۳ ص ۴۸۶ پر زید بن ارقم سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے غدیر خم میں خطبہ دیتے ہوئے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا: "ایہا الناس! میں بھی ایک انسان ہوں

---

[1] شائع کردہ مکتبہ تعمیر ادب، پیسہ اخبار، لاہور، قیمت: ۱/۲۵

اور عنقریب دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔ میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتابِ خدا ہے جس میں نور و ہدایت ہے اس پر عمل کرو اور اس سے تمسک کرو ـــــ اور ایک میرے اہلبیتؑ ہیں جن کے بارے میں میں تمھیں خدا کو یاد دلاتا ہوں، خدا کو یاد دلاتا ہوں، خدا کو یاد دلاتا ہوں ـــــ اسی طرح تین مرتبہ تکرار فرمائی۔

* شیخ عبد الرحمن نقشبندی نے عقد الفرید کے ص۳۴ پر اہلبیتؑ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ یہ حضرات دین کے ستارے، دریائے شریعت کے کنارے اور اصحاب میں منتخب ہیں۔ انھیں سے دین اسلام پھیلا اور انھیں سے استحکام حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا تھا۔ انی تارك فیکم الثقلین ـــــ اور اسی بنا پر حضرتؐ کا ارشاد تھا کہ جسے صلوات کامل بھیجنا ہو وہ یوں کہے اللّٰھم صل علیٰ محمد و آلہ اور اسی بنیاد پر شافعی نے تشہد میں بھی آل محمدؐ پر صلوات بھیجنے کو واجب قرار دے کر اعلان کیا تھا ؎

یا آل بیت رسول اللہ حبکم فرض من اللہ فی القرآن انزلہ
کفاکم من عظیم القدر انکم من لم یصل علیکم لا صلوٰۃ لہ

اے اہلبیتؑ رسولؐ اللہ نے قرآن میں تمھاری محبت واجب کی ہے۔ تمھارے لئے یہی کافی ہے کہ اگر تم پر صلوات نہ بھیجی جائے تو نماز ہی بیکار ہو جائے۔

* مصر کے رسالہ المسلم کے ماہ شعبان ۱۳۷۱ھ کے شمارے میں یہ عبارت درج کی گئی ہے کہ "اہلبیتؑ دین کے محافظ ہیں اور بزرگی کے واقعی وارث ہیں۔ انھیں طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی گئیں اور تاریخ کے ہر دور میں تباہ و برباد کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان کے دشمنوں نے ان کی مخالفت اور ان سے جنگ و جدال کو ایک دینی شعار بنا لیا۔ مختلف ادوار میں انھیں ان کے مال و ملک و وقف سے بے دخل کیا گیا۔ ان پر اتنی مصیبتیں ڈالی گئیں جن کا اندازہ صرف پروردگارِ عالم ہی کر سکتا ہے۔ ان کے خلاف احیاء السنۃ اور اجتہاد الرسولؐ کے نام سے کتابیں تک تالیف کی گئیں۔ والعیاذ باللہ"

* قاموس میں مادہ ثقل میں لکھا ہے کہ ثِقل وزن کے معنی میں ہے اور ثَقَل مسافر کی پونجی کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر عمدہ اور قابلِ تحفظ شے کا نام ثَقَل ہے اور اسی لئے آنحضرتؐ نے

فرمایا تھا" انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی"

* ثعلب الدین نے تاج العروس میں اسی مقام پر تحریر کیا ہے کہ قرآن و اہلبیتؑ کو ثقلین سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان کی شان بلند اور ان کی منزل اعلیٰ ہے۔ ثعلب کے خیال میں ان کے ثقلین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان سے تمسک کرنا اور ان کے ارشادات پر عمل کرنا بڑا سنگین کام ہے۔

* ابن ابی المنظور نے لسان العرب میں تحریر کیا ہے کہ آنحضرت نے آخر عمر میں فرمایا تھا" انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی" اور ثقل ہر عمدہ قابلِ تحفظ شے کو کہتے ہیں۔ حضورؐ نے بھی ان کو ثقل کہا ہے۔ اس لئے کہ ان کی شان اجل وارفع اور ان کی منزل بلند و بالا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے سردار کو بھی ثقل کہتے ہیں۔

* ابن اثیر نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ثقلین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان سے تمسک بڑا دشوار اور نہایت مشکل کام ہے۔

* مصباح میں نقل کیا گیا ہے کہ عترت انسان کی نسل کو کہتے ہیں اور ثعلب کی ابن اعرابی سے روایت کی بنا پر عترت اولاد و ذریت اور صلبی اخلاف کو کہتے ہیں۔

* محمد صدیق حسن بخاری نے اپنی کتاب الدین الخالص ۳ ص۱۱۰ میں زید بن ارقم کے طریق سے روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اہلبیتؑ کی فضیلت اور اسلام میں ان کی عظمت کا تذکرہ ہے۔ یہ حضرات تعظیم و تکریم میں قرآن کے ہمسر ہیں اور ظاہر ہے کہ رسولِ اعظمؐ کے بیان سے بہتر کس کا بیان ہو سکتا ہے۔

* اس کے بعد ص۱۱۲ پر رقم طراز ہیں کہ میرے نزدیک عترت سے مراد واقعی طور پر وہ حضرات ہیں جو زمانۂ رسول اکرمؐ میں موجود تھے لیکن اس کے باوجود ان میں بزرگانِ دین، قائدینِ ملت یعنی ائمہ اثنا عشر بھی داخل سمجھے جائیں گے ــــــ اہلبیتؑ سے مراد فقط ذریتِ طاہرہ اور عترتِ طیبہ ہے۔ اس میں ازواج کا کوئی دخل نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر ہم اس سلسلہ کو جاری رکھیں تو بات زیادہ طولانی ہو جائے گی۔ ہمارے لئے اتنے معتبر حوالے ہی کافی ہیں۔ جب کہ علامہ محمد بن طاہر بن علی قیصرانی نے ایک کتاب بھی تالیف

کردی ہے جس میں حدیث کو ۲۷ اصحاب سے نقل کیا ہے۔

اس مقام پر قابل توجہ امر یہ ہے کہ تحریف پرست افراد نے جہاں اسلام کو تباہ کرنے کے لئے اور وسائل اختیار کئے ہیں وہاں اس حدیث کو بھی اپنی دست برد سے محفوظ نہیں رکھا اور اس طرح ہدایت و نجات کی اس محکم دستاویز کو بھی بدل دینے کی پوری پوری کوشش کی کہ سرکار دو عالم نے امت کو کتاب و عترت کے حوالے کیا تھا اور ان لوگوں نے عترت کے لفظ کو سنت سے بدل دیا تاکہ عترت کا واجب الاحترام ہونا ان کے تمسک کا باعث نجات ہونا، ان کے حق کا قابل لحاظ ہونا اور ان کا صبح قیامت تک باقی رہنا ثابت نہ ہو سکے۔

باوجودیکہ علامہ شریف سمہودی تحریر فرماتے ہیں کہ " اس روایت سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قابل تمسک عترت کے افراد کو تا قیامت باقی رہنا چاہئے تاکہ ان سے اسی طرح استفادہ کیا جا سکے جس طرح کتاب صبح قیامت تک باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عترت کو امان اہل ارض قرار دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر یہ نہ رہیں گے تو اہل زمین تباہ ہو جائیں گے۔ (شرح مواہب لدنیہ ۸ ص )

شیخ زرقانی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ " کتاب سے تمسک اس لئے واجب ہے کہ وہ معدن علوم و اسرار و حکم اور خزانہ حقائق و معارف ہے اور عترت سے تمسک اس لئے ضروری ہے کہ اگر عنصر طیب ہو جائے گا تو دین کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ طیب عنصر سے حسن اخلاق پیدا ہوتا ہے اور حسن اخلاق سے صفا قلب۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا تھا کہ دیکھیں تم ان سے کیا سلوک کرتے ہو۔ میرا اتباع کرکے مجھے خوش کرتے ہو یا میری بات ٹال کر مجھے رنجیدہ کرتے ہو۔ (شرح المواہب)

ظاہر ہے کہ سرکار دو عالم امت کی مصلحتوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ امت کی فلاح و نجات اور اس کی سعادت و نیک بختی عترت و اہلبیتؑ سے تمسک کرنے میں ہے کہ یہ حضرات اس کے حالات سے بہتر واقف ہیں اور اس کی اصلاح کی بہتر تدبیر کر سکتے ہیں۔ اسی لئے آپ نے انھیں سفینۂ نوح سے تشبیہ دی تھی اور حضرت ابوذر غفاریؓ نے زنجیر کعبہ پکڑ کر اس حدیث سفینہ کی تلاوت کی تھی۔ (مسند امام احمد بن حنبل، مستدرک حاکم وغیرہ۔)

طبرانی نے ابو سعید خدری سے یہ حدیث بھی روایت کی ہے کہ "اہلبیتؑ کی مثال باب حطہ کی ہے کہ جو اس دروازے سے داخل ہو گیا اس کے گناہ بخش دیئے گئے۔" اس کے علاوہ بیشمار حدیثیں ایسی ہیں جنھیں اس دور کے علماء نے نقل کیا ہے اور ہر زمانہ کے افراد نے دیکھا اور سنا ہے۔ جن میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اہلبیتؑ سے تمسک ضروری ہے۔ یہ حضرات حق کے داعی اور خلقت کے ہادی ہیں۔ ان کی حیثیت ہدایت کے پرچم اور امت کے قائد کی سی ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر آج بھی امتِ اسلامیہ پوری آزادی کے ساتھ بغیر کسی ذاتی مفاد و مصلحت کے کسی ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہے جو خلافتِ رسولؐ اور قیادتِ امت کا واقعی اہل ہو۔ جس کے ارشادات پر عمل ضامنِ نجات اور جس کے احکام کی تعمیل باعثِ سعادت ہو تو اہلِ بیتؑ کے علاوہ کسی اور کا نام نہ لے سکے گی۔ انھیں حضرات میں خلافتِ الٰہیہ کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں اور یہی وہ مقدس افراد تھے جن کے دامنِ عصمت کو کسی صورت سے داغدار نہیں بنایا جا سکا۔ افسوس! کہ خلافتِ الٰہیہ قیدِ صلاحیت سے نکل کر میراث کی شکل اختیار کر گئی اور اس کے حقداروں میں صاحبِ سیف و سلطنت یزید جیسے لوگوں کا نام بھی آنے لگا۔

ان تمام واضح و روشن بیانات کے بعد یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ امام بخاری کا حضرت صادقؑ کی روایتوں کو اپنی کتاب میں جگہ نہ دینا خود ان کے حق میں مضر تھا۔ اس سے امامؑ کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

آپ کے صدق لہجہ کا کلمہ پوری ملتِ اسلامیہ نے پڑھا ہے اور لطف یہ ہے کہ بخاری نے آپ کے شاگردوں کی روایتیں درج کی ہیں اور ان میں بھی صرف ان روایتوں کو ترک کر دیا ہے جو آپ کے ذریعہ بیان ہوئی تھیں لیکن یہ بھی کوئی زیادہ تعجب خیز بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان حفظِ جان یا ذاتی اغراض کی بنا پر ایسے بہت سے کام کیا کرتا ہے۔ جیسا کہ اسماعیلی نے امام بخاری کی زبانی نقل کیا ہے کہ میری کتاب کی تمام روایتیں صحیح ہیں لیکن جتنی صحیح روایتیں اس میں نہیں آسکیں ان کی تعداد موجودہ روایتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ (ہدایۃ الباری ۱ ص۸)

امام بخاری کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ ان کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد تھیں۔

# امام صادقؑ

۱۔ آپ کے دور کے رؤسا و امراء

۲۔ آپ کے شہر کے حکّام

# تمہید

بنی امیہ نے اپنی پوری حکومت میں آزادیٔ رائے اور حریت ضمیر کے بارے اسلامی تنظیم کی پوری پوری مخالفت کی ہے اور ہمیشہ اس بات کے کوشاں رہے ہیں کہ بانیٔ اسلام کی جانفشانیوں سے پیدا شدہ اتحاد و اتفاق کو افتراق و اختلاف کی شکل میں بدل دیا جائے۔

چنانچہ اسلام نے اتحاد کی تعلیم دی تو انھوں نے افتراق پھیلایا۔ اسلام نے خونریزی سے منع کیا تو انھوں نے اسے کارِ خیر تصور کیا۔ اسلام نے عدل و احسان کا حکم دیا تو انھوں نے ظلم و جور کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیئے اور اس مخالفت میں اس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ اسلام قاصر ہے۔ جاہلیت زدہ اذہان نے حدود اسلام سے باہر نکلنے کو ایک ایسا شیریں خواب تصور کر لیا تھا کہ اسلام ایک قید خانہ سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ترکِ نماز، شرب خمر، قتلِ نفس، حرام خوری کی سزا معین کر چکا تھا۔ وہ امت اسلامیہ کو ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا چاہتا تھا۔ بنی امیہ بنیادی طور پر ان قوانین کے مخالف تھے۔ وہ مصلحت عامہ کے قائل نہ تھے۔ ان کے ذہن انسانیت کی خوش بختی و بدبختی کے مفاہیم سے ناآشنا تھے۔

اسلام کو اس اہم کام کے لئے ایک ایسے نمائندہ کی ضرورت تھی جو بہمہ وجوہ کامل اور کسی وقت بھی اجتماعی مفاد کے سامنے ذاتی غرض پر نظر نہ رکھتا ہو۔ اس کا مقصد صرف یہ ہو کہ امت کو اپنے خون سے سیراب کرے تاکہ اس کے جادے روشن ہوں اور اس سے زندگی کی راہیں اجاگر ہو سکیں۔

اسلام ان مکمل قوانین اور محکم ضابطۂ حیات کا نام ہے جسے بشریت کی رہنمائی کے لئے آسمان

سے نازل کیا گیا ہے جس کی نمائندگی حضرت محمد مصطفےٰؐ جیسے انسانِ کامل کے سپرد کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے محکم قوانین کی نمائندگی بعد پیغمبرؐ بھی آسمان ہی سے ہونی چاہیئے تھی تاکہ اغراض و خواہشات سے پاک و پاکیزہ افراد اس کے احکام کو نافذ کرکے انسان کو اس کی منزلِ کمال تک پہنچا سکیں۔
(ربك يخلق ما يشاء ويختار ما كان لهم الخيرة)

علّامہ کاشف الغطاء ارشاد فرماتے ہیں "امامت، نبوت کی طرح ایک خدائی منصب ہے۔ جس طرح رسالت و نبوت کے لئے نمائندہ کا انتخاب پروردگار کی طرف سے ہوتا ہے اسی طرح امام کا انتخاب بھی قدرت کے اشارے پر ہونا چاہیئے اور نبی کو اس بات کا مامور ہونا چاہیئے کہ وہ امّت میں اپنے نائب کی تعیین کرکے یہ اعلان کردے کہ میرے بعد ان احکام کا ذمہ دار کون ہوگا؟

امامت درحقیقت نبوت ہی کا دوسرا رنگ ہے۔ فرق یہ ہے کہ امام پر وحی نازل نہیں ہوتی ہے اور نبی منزلِ وحی ہوتا ہے۔

نبی کا پیغام آسمان سے آتا ہے اور امام کا پیغام نبوت سے شروع ہوتا ہے۔

امام بھی نبی کی طرح خطا و عصیان سے معصوم، تزکیۂ نفس اور تکمیل بشریت کے لئے مامور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جس کا نفس پاک و پاکیزہ نہ ہوگا اس کی تعظیم بھی باعثِ تکمیل نہیں ہوسکتی ہے۔
لاینال عهدی الظالمین۔

امامت کا وہ مقدّس سلسلہ جو بارہویں امام پر ختم ہوتا ہے نبوّت کی کامل نمائندگی کرتا ہے اور اس میں ہر فرد درجۂ عصمت پر فائز ہے۔"

امام جعفر صادقؑ انھیں اثنا عشر میں سے چھٹے امام اور وہ انسانِ کامل ہیں جنھیں خالقِ کائنات نے نظامِ اسلام کی تطبیق کے لئے منتخب کرکے ان کے حوالے اُمت کی ہدایت کا کام کیا ہے۔ آپ کی عظمت و عصمت کی واضح دلیل یہ ہے کہ دشمن باوجود کثرت جستجو کے آج تک آپ کی زندگی میں کوئی عیب نہیں نکال سکے ہیں اور نہ کسی علمی کمزوری کی نشاندہی کرسکے ہیں۔

آپ اہلبیتِ رسالتؐ کے ایک نمایاں فرد تھے۔ ریاست و سیاست کی پوری ذمہ داری آپ کے حوالے تھی اور یہی وجہ ہے کہ انقلاب پسند افراد نے بارہا اس امر کی کوشش کی کہ حکومت آپ کے حوالے کردیں لیکن آپ نے اپنی دوراندیشی اور مصلحت شناسی کی بنا پر ان کے مطالبہ کو

ٹھکرا دیا۔

ہمارا مقصد امامت و ریاست کے طویل مباحث میں پڑنا نہیں ہے بلکہ ہم ان افراد کے کردار کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنے دور میں ریاست و امامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں لیکن اپنے کردار کا تحفظ نہ کر سکے۔

امام صادقؑ نے ان تمام بداعمالیوں اور بدکرداریوں کا مشاہدہ کیا۔ آپ نے دیکھا کہ خود ساختہ حکام اپنے نفس کی پیاس بجھانے کے لئے انسانیت پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ خلقِ خدا پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے۔ کتاب و سنّت کی مخالفت عام ہے۔ امت کی فلاح و بہبود کے نظام کو پس پشت ڈالنے کی پوری پوری کوشش ہو رہی ہے۔ تنہا آپ نے مظالم برداشت کئے اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا اور یہ سمجھا دیا کہ مفادِ امت پر اپنے مفاد کو قربان کر دینے والے افراد کیسے ہوتے ہیں اور امت کی صحیح قیادت کن افراد کے حوالے ہونی چاہئے۔

امامؑ کا موقف ایک ایسے انسان کا تھا جو اپنے حساس دل کی بنا پر حالات کا صحیح جائزہ لے کر ان سے متاثر ہو لیکن انصار و مددگار کے نہ ہونے کی بنا پر خاموش زندگی بسر کرے۔ مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہو لیکن ان کے مشکلات کا مکمل علاج نہ کر سکے۔ اس کے باوجود آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے اہم فرائض سے انکار نہیں کیا بلکہ ان نازک اور شدید ترین حالات میں بھی اپنے فریضہ پر عمل کرتے رہے۔ امت کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ ظالم و جابر حکام کے ساتھ ان کی بداعمالیوں میں شرکت کسی طرح روا نہیں ہے۔

"آپس کے مقدمات ظالم حکام کے پاس نہ لے جاؤ۔" "جو مومن اپنے مقدمات ظالم حاکم یا قاضی کے پاس لے جائے گا اور اس سے خلافِ قانونِ شریعت فیصلہ کرائے گا وہ اس ظالم کے گناہ میں شریک سمجھا جائے گا۔"

جب دو مومنوں میں کسی حق کے بارے میں اختلاف ہو تو انھیں چاہئے کہ اہلِ ایمان ہی سے فیصلہ کرائیں۔ اگر ایسا نہ کریں گے اور ظالموں کے پاس چلے گئے تو وہ اس آیت کا مصداق ہو جائیں گے جن میں ایسے افراد کو غیر مومن کہا گیا ہے۔"

"اہلِ ایمان! فیصلوں میں احتیاط کرو۔ اس لئے کہ یہ کام اس امام کا ہے جو قضاوت کے

اصول سے واقف اور مسلمانوں میں انصاف کرسکتا ہو، جیسے نبی یا وصیٔ نبی"۔

ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ قاضی کے لئے بادشاہ سے قضاوت کی اجرت لینا جائز ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ حرام ہے۔ اس لئے کہ خود ظالم اور اس کے مددگار اور اس کے ظلم سے راضی ہونے والے سب شریک ظلم تصور کئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ اکثر ان لوگوں سے قطع تعلق کی دعوت دے کر امت کو ظالمین کے خلاف ایک نقطہ پر جمع ہونے کی تلقین فرمائی اس لئے کہ کتاب کریم نے ظالمین کی طرف میلان کو باعثِ جہنم قرار دیا ہے۔

آپ کا قاعدہ یہ تھا کہ امتِ اسلامیہ کو نصیحت فرما کر اپنی عام امت کے فرائض ادا کرتے تھے اور برابر اس بات کے کوشاں رہتے تھے کہ معاشرہ کو اس ظالم نظام سے نکال کر ایک صالح نظام کی شکل میں تبدیل کر دیں۔

اس سلسلے میں ایک مدّت تک جہاد کرتے رہے اور مختلف بادشاہوں کے دورِ حکومت کا مقابلہ کرتے رہے۔ ہر ایک سے الگ رہے اور جب منصور نے ملانے کی کوشش کی تو صاف صاف جواب دے دیا کہ ہمیں فریب دینے کی کوشش نہ کرو۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس تعلق کے پردے میں اپنی بداعمالیوں کو مخفی کرنا چاہتے ہو۔

منصور کا خیال تھا کہ امامؑ کا جواب اثبات میں ہوگا کہ اس کی سلطنت مستقر اور اس کی ہیبت ہمہ گیر ہو چکی تھی۔ لیکن آپ نے اس کی تمناؤں کو خاک میں ملا دیا اور فرمایا کہ "نہ ہمارے پاس دنیا ہے کہ اس کے لئے تجھ سے ڈریں اور نہ تیرے پاس آخرت ہے کہ تجھ سے اس کی امید کریں۔ نہ تو مطمئن ہے کہ ہم اس کی تہنیت پیش کریں اور نہ سلطنت تیرے لئے دنیوی مصیبت ہے کہ اس کی تعزیت پیش کریں! اب ہمارے ساتھ رہنے کا مطلب ہی کیا ہے۔

منصور پر یہ جواب نہایت ہی گراں گذرا لیکن اس کے باوجود وہ امامؑ کی منزل سے متاثر ہو کر کچھ نہ کرسکا اور اس فکر میں لگ گیا کہ ان کو حکومت سے وابستہ ہی کر لیا جائے۔ ان کی علیحدگی بہرحال نقصان دہ ہے۔ چنانچہ اس نے یہ پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے ساتھ رہا کریں اور ہمیں نصیحت کیا کریں۔ آپ نے جواب دیا کہ جو طالبِ دنیا ہے وہ تجھے نصیحت نہ کرے گا اور جو طالبِ آخرت ہے وہ تیرے ساتھ نہ رہے گا۔

---

# عشرۂ ظالمہ

امام صادقؑ کے زمانۂ حیات میں بنی امیہ کے دس بادشاہ گذرے ہیں۔ عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز، یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک، ولید بن یزید بن عبدالملک، ابراہیم بن ولید بن عبدالملک، مروان الحمار۔

بنی عباس کے دو حکام تھے سفاح ومنصور۔

ان سلاطین کی زندگی اور ان کے طرز عمل کا مختصر خاکہ یہ ہے۔

## عبدالملک

عبدالملک کا باپ مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ، اس کی ماں عائشہ بنت معاویہ بن مغیرہ بن ابی العاص تھی یعنی یہ شخص خالص اموی نژاد تھا۔

مروان کا نانا مغیرہ۔ یہ وہی شخص ہے جو حضور اکرمؐ کی مخالفت میں شہرۂ آفاق تھا جس کے بارے میں غزوۂ حمراء الاسد کے موقع پر حضورؐ نے گردن زدنی کا حکم دے دیا تھا۔ (سیرت ابن حزم ص۱۷۵) ابن کثیر کا خیال ہے کہ حضرت حمزہ کی لاش کے مثلہ کرنے میں اس شخص کی بھی شرکت تھی۔ (تاریخ ابن کثیر ۹ ص۶۳)

عبدالملک ۶۵ھ میں اپنے باپ مروان کی جگہ تخت نشین ہوا اور ۸۶ھ میں مع تخت خلافت دنیا سے چل بسا۔ یہ شخص حکومت سے پہلے قاری قرآن، حافظ احادیث اور عابد وزاہد تھا۔

صوفی منش قسم کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے یزید کے ابن زبیر پر حملہ کی مخالفت بھی کی تھی اور اس کے فوجیوں سے کہا تھا کہ تم اسلام کے پہلے مولود اور رسول اللہؐ کے حواری زبیر کے لال پر حملہ آور ہو رہے ہو۔ ابن زبیر دن میں صائم اور رات میں قائم رہتے ہیں۔ ان کا قتل ایک دنیا کو مستحق جہنم بنا سکتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جب خلافت ہاتھ میں آگئی تو اسی فوج کو حجاج کے ساتھ ابن زبیر کے قتل کے لئے روانہ کر دیا۔ (تاریخ المدینۃ الشریفہ للسخاوی ج ۲ ص ۳۱۷) جس کا قصہ یہ تھا کہ تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد عبدالملک نے حجاج کی سرکردگی میں شامیوں کی فوج ابن زبیر سے جنگ کے لئے روانہ کی۔ اس لشکر نے ۶ مہینہ ۱۷ دن تک مکہ کا محاصرہ رکھا اور حجاج منجنیق سے خانۂ خدا کو سنگسار کرتا رہا۔ (شفاء العزام للقاضی تقی الدین المکی ج ۱ ص ۱۶۹)

ابن عساکر م ۵۷۱ھ کا کہنا ہے کہ حجاج کے ابتدا کرتے ہی پوری قوم نے کعبہ کو نشانہ بنا لیا اور مشق سنگ کے ساتھ مشق شعر و سخن بھی ہونے لگی۔ ان اشعار کا شروع ہونا تھا کہ ایک بجلی گری اور سب خاکستر ہو گئے۔ جس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا لیکن حجاج نے یہ فریب دیا کہ بنی اسرائیل میں آگ کا نازل ہونا قربانی کی قبولیت کی علامت تھا۔ لہٰذا انھیں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج دوبارہ سنگ باری پر آمادہ ہو گئی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ۷۳ھ میں ابن زبیر کا قتل نہ ہو گیا۔ حجاج نے قتل کرنے کے بعد لاش کو الٹا کر کے سولی پر لٹکا دیا اور سر عبدالملک کے پاس بھیج دیا۔ اس نے بھی تمام شہروں میں اس کی تشہیر کی۔ (شفاء العزام ۱ ص ۱۷۱)

عبدالملک نے جس وقت خلافت کی منزل میں قدم رکھا اس وقت قرآن ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی اپنے خلیفہ ہونے کی بشارت سنی قرآن سے خطاب کیا "آج میرے اور تیرے درمیان جدائی کا دن ہے۔" (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۲۱۶ تاریخ ابن کثیر ۹ ص ۶۲)

ابن کثیر کا بیان ہے کہ عبدالملک نے ۷۵ھ میں حج کے موقع پر لوگوں کو جمع کر کے یہ خطبہ دیا۔ "میرے پہلے کے خلفاء تو کھایا اڑایا کرتے تھے لیکن میرے پاس اس امت کا علاج صرف تلوار ہے۔ میں عثمان کی طرح ضعیف و ناتواں، معاویہ کی طرح صلح پسند اور یزید جیسا انسان نہیں ہوں۔ میں اسی وقت تک برداشت کر سکتا ہوں جب تک میرا لشکر تیار نہ ہو۔ اس کے بعد پھر کوئی بچاؤ کا امکان نہیں ہے۔ دیکھو یہ عمرو بن سعید میرا قرابتدار ہے لیکن جب اس نے بیعت سے نفی میں سر ہلایا

تو میں نے اس کا جواب تلوار سے دیا۔ میں نے اللہ سے یہ عہد کر لیا ہے کہ جس کی گردن میں طوقِ بیعت ڈالوں گا۔ زندگی بھر نکلنے نہ دوں گا۔ پھر حاضرین سے کہا کہ غیر موجود لوگوں تک اطلاع پہنچا دیں۔
(تاریخ ابن کثیر ۹ ص۶۴)

عمرو بن سعید الشرق یہی وہ شخص ہے جسے پناہ دے کر اور ولی عہد بنا کر دھوکے سے عبدالملک نے اپنے ہاتھوں سے ۶۹ھ میں تہ تیغ کر دیا اور قتل کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ مجھے بہت عزیز تھا لیکن ایک مادہ پر دو نر نہیں جمع ہو سکتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب، ص۳۷)

عبدالملک خونریزی اور سفاکی میں اس قدر ماہر تھا کہ جب امام الدرداء نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ تو نے عبادت و زہد کے بجائے شراب پینا شروع کر دی ہے تو اس نے جواب دیا کہ "فقط یہی نہیں، خون پینا بھی شروع کر دیا ہے۔"

عبدالملک کا پہلا قدم یہ تھا کہ اس نے ایک عام اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص مجھے تقوی الٰہی کی ہدایت کرے گا میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔"

یہی وہ شخص تھا جس نے حجاج کو حجاز و عراق کا والی بنا کر مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کر دیا تھا۔ وہ حجاج جس کی تلوار ہمیشہ نیک سیرت لوگوں کے سروں پر علم رہتی تھی۔ جس کے زندان میں ایک لاکھ مرد و عورت یوں اسیر رہتے تھے کہ ان کے سر پر دن کی دھوپ اور رات کی اوس رہتی تھی۔ گرسنگی کی مصیبت کا سامنا کرتے تھے۔ سر پر گرم راکھ ڈالی جاتی تھی۔ ایک طرف آفتاب کی حرارت، دوسری طرف راکھ کی گرمی۔ ایک طرف تازیانہ کی شدت اور دوسری طرف نیزہ کی تکلیف۔

ان تمام باتوں کے علاوہ جو چیز اسے سب سے زیادہ مرغوب تھی وہ تھی قیدیوں کی آہ و فریاد اور جس چیز سے اس کا دل زیادہ بہلتا تھا، وہ تھا ان کا نالہ و شیون۔

اس کی تلوار آزاد اور اس کے مظالم نت نئے۔ کسی کے جسم کو زخمی کر کے اس پر سرکہ چھڑک دیا، کسی کے پیروں میں تیر نصب کر دیا تاکہ ان کی صدائے نالہ و شیون سے نغمہ و طرب کا فائدہ اٹھائے۔
(کامل ابن اثیر ۴ ص۲۳۶)

عمر بن عبدالعزیز کا مقولہ تھا کہ "اگر ہر امت اپنے خبیث ترین شخص کو لے کر آئے اور ہم تنہا حجاج کو مقابلہ میں پیش کر دیں تو سب پر غالب آجائیں گے۔" (تاریخ کامل ۴ ص۲۷۱)

عاصم کا بیان ہے کہ "حجاج نے ہر ممکن طریقہ سے خدائی احکام کی ہتک حرمت کی ہے۔" (تاریخ ابن کثیر ۹ ص۱۳۲)

حسن بصری سے عبد الملک کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس شخص کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے جس کے گناہوں میں سے حجاج بن یوسف ایک گناہ ہو۔" (ابو الفداء ا ص۲۰۹)

عبد الملک کا دستور تھا کہ حجاج کو اس کے تمام مظالم پر تحسین و آفرین کہے۔ اس کی کمک و امداد کرے اور اس کے خلاف حرفِ شکایت نہ سن سکے۔

اس نے مرتے وقت بھی اپنے ولی عہد ولید سے یہ وصیت کر دی تھی کہ اس کی تعظیم و تکریم کرے۔ (سیوطی ص۸۵)

ظاہر ہے کہ یہ وصیت بھی حق بجانب تھی۔ اس لئے کہ حجاج عبد الملک کو رسول اللہ سے بہتر سمجھتا تھا اور اس کے لئے یہ بات کوئی عجیب نہ تھی۔ تعجب ان مسلمانوں سے ہے جو ایسے حجاج کی سیاہ کاریوں کو دین کا رنگ دینا چاہتے ہیں اور اسے داخل بہشت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

عبد الملک کی بد طینتی کا یہ عالم تھا کہ جب حجاج کے خلاف کوئی شکایت آتی تو اسے پس پشت ڈال کر اس کی مزید حمایت کرتا۔ خونریزی میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔

اس نے ولید کو ان الفاظ میں وصیت کی "ولید اب میری رحلت کا وقت آگیا ہے۔ میں دنیا سے جا رہا ہوں"

ولید یہ سن کر رونے لگا تو اس نے ڈانٹ کر کہا، یہ کیا عورتوں کی طرح سے رو رہا ہے؟ دیکھ! جب میں مر جاؤں تو غسل و کفن دے کر نماز پڑھنا اور مجھے عمر بن عبد العزیز کے حوالے کر دینا۔ وہ قبر میں اتارے گا۔ تم منبر پر بیٹھ کر بیعت کا اعلان کر دینا۔ اگر کوئی ذرا بھی انکار کرے تو تلوار سے اس کی گردن اڑا دینا۔ تمھاری نظر میں قرابت داری یا دوستی کسی بات کا خیال نہ ہونا چاہئے۔ اور دیکھو! حجاج کا خاص خیال رکھنا۔" (الامامة والسیاسة ۲ ص۱۶۴)

آپ سوچیں کہ اس طریقۂ انتخاب میں امت کو کوئی حق ہے یا سب بیعت پر مضطر و مجبور ہیں؟ کیا اس خونریز خلافت کے وارث کو امیر المومنین کہا جا سکتا ہے؟ کیا اسلام نے یہی نظام رائج کیا تھا؟

عبدالملک میں اتنی سی بات ضرور تھی کہ وہ بنی ہاشم کا خون بہانے سے گریز کرتا تھا جس کا سبب اس کی دیانتداری یا احتیاط پسندی نہ تھی بلکہ وہ آلِ ابی سفیان کے انجام سے سبق لے رہا تھا۔ اس نے حجاج کو خط لکھا تو اس میں بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا لیکن اس کے باوجود اس خبیث نے امام زین العابدینؑ کو مقید کرا کے مدینہ سے شام بلا لیا۔ (حلیۃ الاولیاء ۳ ص۱۳۵)

## ولید بن عبدالملک

اپنے باپ کا ولی عہد رہنے کے بعد اس کے مرتے ہی ۱۵ر شوال ۸۶ھ یوم پنجشنبہ کو تختِ حکومت پر بیٹھا اور ۱۵ر جمادی الاولیٰ ۹۵ھ کو ۴۶ سال کی عمر میں ۹ سال، ۷ مہینے حکومت کر کے دنیا سے چل بسا۔

اس کی ماں کا نام ولادہ بنت عباس بن جزء بن زہیر بن جذیمہ عبسی تھا۔

غیظ و غضب میں اپنی مثال آپ تھا۔ نکاح و طلاق کا یہ عالم تھا کہ کنیزوں کے علاوہ ۶۲ عورتوں سے عقد کیا۔ کھانے پینے میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ گفتگو میں غلطیوں کا بھی وہی انداز تھا۔ (مآثر الانافہ ۱ ص۱۳۳)

اسی ولید نے دمشق کی جامع اموی کی تعمیر کرائی تھی جس پر ۴۰۰ صندوق سونا صرف ہوا تھا۔ جب کہ ہر صندوق میں ۱۴ ہزار یا ۲۸ ہزار دینار تھے۔ لوگوں نے بیت المال سے اس زرِ کثیر کے خرچ کرنے پر ملامت کی تو اس نے جواب دیا کہ یہ سب میرا ذاتی مال ہے۔

ولید ہی نے مسجد نبوی کی توسیع کرا کے ازواج کے حجرے داخلِ مسجد کر دیئے تھے اور اس پر نقش و نگار اور طلا کاری کرائی تھی جس پر خبیب بن عبداللہ نے اعتراض بھی کیا کہ ان حجروں کے خاتمہ سے قرآن کریم کی آیت حجرات ختم ہو رہی ہے۔ ولید نے اس بات پر ان کی مرمت کا حکم دے دیا اور وہ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

ولید ہی کے دورِ حکومت میں ۲۵ر محرم ۹۵ھ کو امام زین العابدینؑ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ کو ولید ہی نے زہر دیا تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے ولید کے ایماء پر ایسا کیا تھا۔ (تاریخ قرمانی، صواعق، فصول مہمہ، دلائل الامامۃ، روضۃ الواعظین وغیرہ۔)

اس کے زمانہ میں حجاج نے شعبان ۹۵ھ میں سعید بن جبیر کو قتل کرایا جس کا واقعہ یہ تھا کہ سعید حجاج کے مظالم سے ڈر کر مکّہ کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ حجاج نے ولید کو اس کی اطلاع دی۔ اس نے مکّہ کے عامل خالد قسری کو لکھا۔ خالد نے سب کو گرفتار کرا کے حجاج کے پاس بھیج دیا۔ اس جماعت میں سعید کے علاوہ عطا، مجاہد، طلق بن حبیب اور عمرو بن دینار بھی تھے۔ سعید نے حجاج سے باقاعدہ گفتگو کی۔ اس نے بدکلامی سے کام لیتے ہوئے سعید سے عبدالملک کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے کہا کہ "میں اس کے بارے میں کیا کہوں جس کی برائیوں میں سے تو ایک ہے"۔

حجاج کو اس بات پر غصہ آگیا اور اس نے قتل کا حکم دے دیا۔ سعید نے کلمۂ شہادت زبان پر جاری کر کے حجاج کو اس کا گواہ بنایا۔ اس نے ایک نہ سنی اور قتل کرا دیا۔ لیکن بعد میں بدحواس ہو کر چیخنے لگا۔ ہماری بیڑیاں، ہماری بیڑیاں! لوگوں نے خیال کیا کہ حجاج بیڑیاں اتروانا چاہتا ہے چنانچہ سعید کے پیر کاٹ کر بیڑیاں اتار دی گئیں۔ حجاج کا عالم یہ تھا کہ سوتے سوتے چونک پڑتا تھا اور کہتا تھا۔ ہائے! سعید نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ سعید نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ (ابن خلدون ۳ ص۶۵، طبری ۸ ص۹۵) مگر اس کے بعد حجاج چند ہی دن زندہ رہ سکا اور ماہِ رمضان میں واصلِ جہنم ہوگیا۔ اسی کے دوسرے سال جمادی الاوّل یا جمادی الآخر میں ولید بھی اس سے جا ملا۔

حجاج کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص اس کے خوف سے بھاگ کر ایک دیہات میں پہنچا۔ دیکھا کہ ایک کتا سایہ دار جگہ پر سو رہا ہے۔ اس نے کہا، اے کاش میں کتا ہی ہوتا کہ حجاج کے ظلم سے آرام تو پا سکتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پلٹ کر آیا تو دیکھا کہ کتا مرا ہوا پڑا ہے۔ اس نے سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حجاج نے تمام کتّوں کے قتل کا حکم جاری کر دیا ہے۔ (شرح العیون ابن نباتہ ص۹۶)

حجاج کا دعویٰ تھا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اور وہ کوئی کام بغیر وحیِ الٰہی کے نہیں کرتا ہے۔ (ابن عساکر ۴ ص۸۱) جس سے اس حدیث شریف کی تصدیق ہوتی تھی "بنی ثقیف میں خونریز اور جھوٹے افراد پیدا ہوں گے"۔

## سلیمان بن عبدالملک

باپ کی وصیّت کی بنا پر اپنے بھائی ولید کے بعد ۱۵ر جمادی الاخریٰ ۹۶ھ کو تختِ حکومت

پر متمکن ہوا اور ۱۰ ار صفر ۹۹ھ کو دو سال ۹ مہینہ کچھ دن حکومت کرکے دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ولید کا ارادہ تھا کہ سلیمان کو معزول کرکے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد بنائے لیکن سلیمان نے اس کی مخالفت کی۔ اس نے اپنے عمال سے مشورہ کیا تو حجاج اور قتیبہ بن مسلم کے علاوہ کسی نے بھی اس کی حمایت نہ کی۔
(سمط النجوم العوالی عبدالملک العصامی ۳ ص۱۸۷)

نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان نے آلِ حجاج پر شدت شروع کر دی اور قتیبہ کو ۹۹ھ میں قتل کرا دیا۔ حجاج کے عاملوں کو معزول کرکے اس کے ۸۱ ہزار قیدیوں کو ایک دن میں رہا کر دیا۔ اس وقت حجاج کے قید خانہ میں ۳۰ ہزار عورتیں اور ۳۰ ہزار بے گناہ مرد تھے۔ (ابن عساکر ۴ ص۸۰)

سلیمان نے حجاج کے کاتب یزید بن مسلم کو گرفتار کرا کے بلایا اور جب وہ پیش ہوا تو سلیمان نے کہا کہ خدا اس پر لعنت کرے جس نے تجھے صاحبِ اختیار بنایا ہے۔

یزید نے کہا اے امیرالمومنین! تو نے مجھے آج دیکھا ہے جب اختیار میرے ہاتھ سے جا رہا ہے اور تیرے ہاتھ میں آ رہا ہے۔ کاش .... سلیمان نے کہا کہ بتاؤ کہ حجاج جہنم میں کسی جگہ ٹھہر گیا ہے یا ابھی دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ حجاج کے بارے میں ایسی گفتگو نہ کر۔ اس نے تجھے نصیحت کی ہے۔ تیری حفاظت کی ہے۔ تیرے دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے مخالفت کی ہے۔ قیامت کے دن اس کے داہنے جانب عبدالملک ہوگا اور بائیں جانب ولید۔ اب اس کی جو جگہ چاہے طے کر لے۔ سلیمان کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ اس نے کہا باہر نکل جا تجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ (مروج الذہب ۲ ص۱۸۲)

سلیمان اکثر اوقات عمر بن عبدالعزیز سے مشورہ کرتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ حکومت کی تدبیروں سے ناواقف ہوں۔ جو بات تمہاری نظر میں مناسب ہو اسے جاری کر دو۔ چنانچہ اس نے نماز کو آخر وقت سے ہٹا کر مثل سابق پھر اوّل وقت میں کر دیا۔ (البدایہ والنہایہ ۹ ص۱۷۸)

سلیمان نے ایک رات میں اپنے لشکر سے گانے کی آواز سنی اور یہ سن کر اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ جب اس منزل تک پہنچا تو کہنے لگا کہ ہر جانور اپنی مادہ کو رام کرنے کے لئے ایک خاص نغمہ رکھتا ہے۔ تم بھی اس گانے سے عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہہ کر حکم دے دیا کہ سب کو خصی کرا دیا جائے۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ اے امیر! یہ تو مثلہ کرنا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ لہذا انھیں نکال باہر کیجئے۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ (ابن کثیر ۹ ص۱۸۰)

مورخین کا کہنا ہے کہ سلیمان زیادہ کھانے میں ایک خاص مہارت رکھتا تھا۔ بعض حضرات نے اس کی خوراک ۱۰۰ رطل تک لکھی ہے۔ باریک اور رنگین کپڑے پہننے کا شائق تھا۔ تمام لوگوں کو رنگین نقش ونگار کی ردا، جبہ، پیجامہ، عمامہ، ٹوپی پہناتا تھا۔ اس کا یہ حکم تھا کہ کفن بھی ایسے ہی کپڑے میں دیا جائے۔ (مروج الذہب ۳ ص۱۸۵)

مال جمع کرنے کا بھی ایک خاص ظالمانہ انداز تھا۔ ایک مصر کے عامل اسامہ بن زید تنوخی کو لکھا کہ مصر سے خراج وصول کرو۔ پہلے دودھ اور جب وہ ختم ہو جائے تو خون۔

مورخ کندی کہتا ہے کہ اہلِ مصر پر یہ پہلا ظلم تھا۔ سلیمان کو اسامہ کا طرزِ عمل بہت پسند آیا اور اس نے اعلان کردیا کہ اسامہ رشوت نہیں لیتا ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ اس نے کہا کہ ایک شخص اسامہ سے بھی بدتر ہے اور وہ بھی رشوت نہیں لیتا ہے۔ سلیمان نے پوچھا وہ کون ہے؟ اس نے کہا، دشمنِ خدا ابلیس! سلیمان یہ سن کر غصہ میں اٹھ کر چلا گیا۔ (النجوم الزاہرہ ۱ ص۲۳۲)

اسامہ مالِ خراج لے کر سلیمان کے پاس آیا اور عرض کیا۔ اے امیر! میں نے رعیت کو بے جان کر دیا ہے لہذا اگر ممکن ہو تو اب کچھ رحم کر کے خراج میں تخفیف کر دیجئے تاکہ یہ شہر کو آباد رکھ سکیں۔ باقی آیندہ سال دیکھا جائے گا۔ اس نے بگڑ کر کہا۔ تیری ماں تجھے روئے۔ میں نے کہہ دیا کہ دودھ ہے تو دودھ ورنہ خون۔ (جہشیاری ص۳۲)

سلیمان نے اپنے غیظ وغضب کا مظاہرہ اس اسلامی فاتح موسیٰ بن نصیر پر بھی کیا جس نے مغرب کو فتح کر کے اسلام کے حدود میں اضافہ کیا تھا اور محبتِ اہلبیتؑ میں ڈوب کر استقلال واستقامت کا کامل نمونہ پیش کیا تھا۔

مورخین کی یہ بھی ایک ناانصافی تھی کہ انھوں نے اس مجاہد کے کارنامے کو نظر انداز کر کے تمام فضائل کو ان کے غلام طارق بن زیاد کی طرف منسوب کر دیا جس کا سارا کام موسیٰ ہی کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

موسیٰ بن نصیر نے فتح مغرب میں وہ کارنمایاں انجام دیا ہے جس کی نظیر مشکل ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ ہر شہر کی طرف اپنے بیٹے عبدالعزیز اور اپنے غلام طارق کو بھیجتے تھے اور وہ اسے فتح

کر کے مالِ کثیر اپنے ہمراہ لے کر واپس آتے تھے۔

سلیمان سے اس عظیم مجاہد کا وجود بھی برداشت نہ ہوسکا۔ اور اسے اذیت پہنچانے کے لئے اس کے بیٹے عبدالعزیز جیسے عابد و زاہد انسان کو تہ تیغ کرا دیا۔

مورخین نے بھی حکومت کی خوشامد میں اس کے خلاف تہمتیں وضع کر دیں اور یہ سانحہ ۹۸ھ میں وقوع پذیر ہوگیا۔

ابن اثیر کا کہنا ہے کہ سلیمان نے یہ بہت بڑی غلطی کی۔ بیٹے کا کام تمام کرنے کے بعد سلیمان نے باپ کی طرف توجہ کی اور موسیٰ کو براہِ راست اذیتیں پہنچانا شروع کیں۔ ۴۰ لاکھ دینار اور ۳۰ ہزار درہم ان کے ذمے ڈال دیئے۔ عبدالعزیز کا سر کاٹ کر ان کے سامنے پیش کر دیا۔ موسیٰ نے یہ دیکھ کر صبر کیا اور کہا ایسے صائم النہار، قائم اللیل انسان کے لئے شہادت مبارک ہے۔ موسیٰ محبت اہلبیتؑ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ سب سے پہلے ان پر معاویہ نے مشق ستم کی کہ جنگ صفین میں انھوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

## عمر بن عبدالعزیز

ابوحفص عمر، باپ کا نام عبدالعزیز بن مروان بن الحکم اور ماں کا نام ام عاصم لیلیٰ بنت عاصم بن عمر بن الخطاب۔ سلیمان کے بعد ۱۰ ر صفر ۹۹ھ بروز جمعہ تخت حکومت پر متمکن ہوا اور ۲۵ ر رجب ۱۰۱ھ دو سال پانچ مہینے پانچ دن حکومت کر کے دنیا سے چل بسا۔

اس کا باپ عبدالعزیز عبدالملک کے بعد مروان کا ولی عہد تھا لیکن اس کی زندگی ہی میں ۸۶ھ میں انتقال کر گیا تھا۔

عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت میں لوگوں کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا اور چند دنوں کے لئے ظلم و تشدد سے نجات مل گئی۔ نفس پرست حکام اور لاقانونیت شعار اقتدار کے ٹھیکیدار بے بس ہوگئے اور رعایا چین کی زندگی گذارنے لگی۔ عمر کی نظر میں سب سے اہم مسئلہ خراج کا تھا اس لئے کہ اس میں بے حد مظالم ہوچکے تھے۔ اور امت اموی خود غرض حکام کے ہاتھوں پامال ہوچکی تھی چنانچہ اس نے نہایت ہی ذہانت و ذکاوت سے اس مسئلہ کو حل کیا اور اپنے عاملِ عراق کو واضح لفظوں میں

لکھ دیا: "یاد رکھو، اہلِ کوفہ بہت زیادہ مصائب جھیل چکے ہیں، حکامِ جور نے انھیں بہت زیادہ پریشان کیا ہے حالانکہ دین کا قیام عدل و احسان سے تھا۔ لہٰذا اب تمھارا فرض ہے کہ اپنے نفس کو عزیز سمجھتے ہوئے اسے خدائی مسئولیت سے بچاؤ۔ بقدرِ امکان خراج لو اور باقی سے زمین کی آبادی کا انتظام کرو۔ خراج کی وصولی اور تحصیل میں سہولت سے کام لو۔ عیدوں اور تقریبوں کا نذرانہ مت وصول کرو۔ قرآن کی قیمت، مکان کا کرایہ، نکاح کا پیسہ وغیرہ مت لیا کرو۔ اگر صاحبِ خراج مسلمان ہو جائے تو اس کے ٹیکس کو معاف کر دو اور ان تمام مسائل میں میرے احکام کی پابندی کرو۔ بغیر میرے کسی کام پر اقدام نہ کرو۔ اگر کوئی شخص حج کرنا چاہے تو اسے حج کرنے کے لئے سو دینار دے دو۔ والسلام"
(کامل ابن اثیر ۵ ۱۹، طبری ۸ ۱۳۹)

عمر نے علویین کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا۔ ان پر اموال تقسیم کئے اور عاملِ مدینہ کو حکم دیا کہ ن پر دس ہزار دینار تقسیم کر دو۔

اس نے دریافت کیا کہ علیؑ کی اولاد تو مختلف قبیلوں میں ہے، کس کس پر تقسیم کیا جائے؛ عمر نے جواب دیا کہ میرا خط پاتے ہی ساری رقم اولادِ فاطمہؑ پر تقسیم کر دو۔ اس لئے کہ ان کے حقوق بہت زیادہ پامال ہوئے ہیں۔ والسلام۔ (مروج الذہب ۳ ۱۹۴)

ایک مرتبہ فاطمہ بنت علیؑ، عمر کے پاس آئیں تو اس نے کہا کہ خدا کی قسم روئے زمین پر تم سے یادہ محبوب گھرانے والے نہیں ہیں۔ تم لوگ میری نظر میں میرے اہلبیت سے زیادہ عزیز ہو۔
طبقات ابن سعد ۵ ۲۲۳)

ابن اثیر کا بیان ہے کہ عمر، حضرت امیرؑ سے اس قدر محبت صرف اس لئے کرتا تھا کہ یہ مدینہ ں عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کا شاگرد تھا۔ ایک مرتبہ استاد کو اس کے بارے میں یہ خبر دی ں کہ یہ حضرت علیؑ کے بارے میں کچھ کہتا ہے۔ یہ حاضر ہوا تو استاد نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز ختم کر کے ھوں نے سوال کیا کہ تم سے یہ کس نے بتایا ہے کہ اللہ نے اہلِ بدر، اہلِ بیعتِ رضوان پر غضب نازل یا ہے؛ اس نے عرض کیا کہ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔

استاد نے کہا، پھر یہ تم نے علیؑ کے بارے میں کیا کہا ہے؛ اس نے عرض کیا مجھے معاف کر دیجئے۔ ب آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

عمر کا اپنا بیان ہے کہ میرا باپ اثنائے خطبہ میں حضرت علیؑ کی برائی کرتا تھا تو اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے کہا، کیا تم اس لکنت کو محسوس کرتے ہو۔

میں نے عرض کیا جی ہاں۔

کہنے لگا کہ اگر میرے چاہنے والے علیؑ کے فضائل سے آشنا ہو جائیں گے تو مجھے چھوڑ کر ان کی اولاد کی طرف رجوع کرلیں گے۔ اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ عمر نے حکومت پاتے ہی اس سنتِ خبیثہ کو ترک کر کے خطبہ میں اِنَّ اللہَ یَأمُرُ بِالعَدلِ وَالاِحسَانِ کی آیت کو شامل کر دیا جس کے باعث تمام مسلمانوں کے دلوں میں بادشاہ کی عظمت جاگزیں ہوگئی اور جابجا اس کا ذکر خیر ہونے لگا۔ (ابن اثیر ۵ ۲۰) اگرچہ امویین کو یہ بات ناگوار تھی اور عمر کے بعد انھوں نے پھر اس بدعت کا ارادہ کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۰۶ھ میں ہشام بن عبدالملک سے حج کے موقع پر سعید بن الولید بن عثمان نے کہا، یا امیرالمومنین! اللہ ہمیشہ آپ کے گھر والوں پر نعمتیں نازل کرتا رہے اور خلیفۂ مظلوم عثمان کے جانشینوں کی نصرت کرتا رہے! لوگ ان بابرکت مقامات پر برابر ابوتراب پر لعنت کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ آپ بھی اس سیرت پر عمل فرمائیں۔ ہشام کو یہ مطالبہ بہت شاق گذرا اور اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ میں کسی کو سب وشتم نہیں کرتا۔ (طبری ۸ ۸۶)

عمر بن عبدالعزیز کے دفترِ اعمال میں ایسے کارہائے خیر بھی ہیں جن کی نظیر بنی امیہ کی تاریخ میں نہیں مل سکتی ہے۔ بنی امیہ کی نظروں میں اس کے یہ اعمال کھٹک رہے تھے۔ اور اسی لئے بعض مورخین کے قول کی بنا پر انھیں لوگوں نے اسے زہر دیدیا۔ خیال یہ تھا کہ اگر اس کی حکومت باقی رہ گئی تو رفتہ رفتہ سلطنت کا رشتہ بنی امیہ سے ٹوٹ جائے گا اور اس کی باگ ڈور باصلاحیت افراد کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ (مآثر الانافہ فی معالم الخلافہ ۱ ۱۴۴)

## تنبیہ

بعض مورخین نے یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک روز عمر بن عبدالعزیز نے مکہ میں خطبہ دیتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جو شخص میرے ذمہ کوئی حق رکھتا ہو وہ اس کا تقاضا کرے تو امام زین العابدینؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ نے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔

اس نے پوچھا کہ آپ کا حق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہی مقام جس پر تو قابض ہے۔ اس نے عرض کیا کہ مجھے اس کا علم نہیں تھا لیکن اگر آج بھی امت آپ کی حکومت سے راضی ہے تو میں حاضر ہوں۔ (سمط النجوم العوالی ۳ ص ۲۰۴)

ہمیں یہ واقعہ تسلیم ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کو اہلبیتؑ رسالت کی عظمت اور ان کے استحقاق کا اعتراف تھا اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اہلبیتؑ نے وقت و موقع کی مناسبت سے اپنے حق کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس واقعہ کی تائید نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ امام امت کے حالات سے باخبر اور اس کے رجحانات سے واقف تھے۔ آپ نامناسب ماحول میں ایسا تقاضا بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ کہ امام سجادؑ کا انتقال ۹۵ھ میں ہوا ہے اور عمر بن عبدالعزیز کو حکومت ۹۹ھ میں ملی ہے۔ لہذا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ امام اس کے دور حکومت میں کوئی احتجاج کریں۔

اس قسم کا ایک فرضی واقعہ یہ بھی ہے کہ امام زین العابدینؑ نے مروان بن الحکم سے چار ہزار دینار قرض لئے اور بنی مروان میں سے کسی نے اس کا تقاضا نہیں کیا اور جب حکومت ہشام کے ہاتھ میں آئی تو اس نے آپ سے کہا کہ ہمارے جد نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ آپ نے فرمایا کہ بہت اچھا اور قابل شکریہ۔ اس نے کہا اچھا اب کوئی ضرورت نہیں ہے آپ اسے اپنے پاس ہی رکھئے۔

اس واقعہ کے فرضی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ ہشام کو حکومت ۱۰۵ھ میں ملی ہے اور امامؑ کا انتقال ۹۵ھ میں اس کی حکومت کے دس سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔

## یزید بن عبدالملک

عاتکہ بنت یزید بن معاویہ کا فرزند یزید بن عبدالملک بن مروان، عمر بن عبدالعزیز کے بعد ۱۰۱ھ میں تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ اور چار سال ایک مہینہ دو دن حکومت کر کے ۲۶ شعبان ۱۰۵ھ بوقت شب جمعہ اس دار فانی سے چل بسا۔

ابتدائے حکومت میں اس کا ارادہ تھا کہ عمر بن عبدالعزیز کی سیرت اختیار کرے لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اہل باطل، بدسرشت، خبیث النفس اشخاص کے لئے ناقابل برداشت تھی لہذا چالیس بزرگ افراد نے آکر اس بات کی شہادت دی کہ خلفاء کرام حساب و کتاب اور عذاب و عتاب سے مستثنیٰ ہوتے

ہیں۔ (ابن کثیر ۹ ۱۳۲)

اور یہ سنتا تھا کہ وہ پھڑک اٹھا۔ خواہشات نفس کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ لہو و لعب، لذت و طرب اس کا خاص مشغلہ بن گیا اور خوفِ خدا کا کوئی محل و مقام نہ رہ گیا۔ (سمط النجوم العوالی ۳ ۲۰۹)

ان حالات کا رونما ہونا تھا کہ ملک، عمر بن عبدالعزیز کے پہلے والی کیفیت کی طرف پلٹ گیا، خراج کی دشواریاں بروئے کار آگئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے عمال کی طرف فرمان بھیجا۔ "عمر بن عبدالعزیز ایک فریب خوردہ انسان تھا۔ اس کے اقدامات کو منسوخ کر کے قدیم روش اختیار کی جائے۔ خراج بہر حال وصول کیا جائے۔ چاہے خوشحالی ہو یا خشک سالی۔ عوام خوش رہیں یا ناخوش، زندہ رہیں یا مر جائیں۔ (العقد الفرید ۳ ۱۸۰)

ابن اثیر کے بیان کے مطابق یزید نے عمر بن عبدالعزیز کے وہ تمام طریقے اپنی خواہش کی مخالفت کی بنا پر بدل ڈالے اور اس سلسلے میں نہ دنیا کی ملامت کا خیال کیا اور نہ آخرت کے عذاب کا۔ انتہا یہ کہ یمن میں حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کی خراج کی سختی میں عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دورِ حکومت میں کمی کر دی تھی اور یہ کہہ دیا تھا کہ میری آمدنی کم ہو جائے یہ اچھا ہے لیکن رعیت کی بدحالی اچھی نہیں ہے۔ لیکن یزید نے حکومت سنبھالتے ہی پھر پرانا طریقہ رائج کر دیا اور اپنے عامل کو سختی سے خراج وصول کرنے کا حکم بھیج دیا۔ (کامل ۵ ۳۲)

یزید کو لہو و لعب سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اس کے پاس حبابہ اور سلامہ دو کنیزیں تھیں جن سے اکثر لطف اندوز ہوتا تھا۔ حبابہ کے انتقال سے یزید کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ خود بھی چند دنوں کے اندر راہئ ملکِ عدم ہو گیا۔ یزید نے حبابہ کی محبت کا اظہار اس انداز سے کیا تھا کہ چند دنوں تک اس کی لاش دفن نہ ہونے دی بلکہ بعض مورخین کے بیان کے مطابق چند دنوں کے بعد لوگوں کے زور دینے سے لاش کو دفن کرا دیا لیکن ایک دن قبر کھود کر پھر لاش نکلوائی اور اس کے دیدار سے اپنے نفس کو تسکین پہنچائی۔ (الاغانی ۱۳ ۱۴۶، البدء والتاریخ ۳ ۴۸)

# ہشام بن عبدالملک

یزید کے بعد اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک ۲۵ رشعبان ۱۰۵ھ کو تخت حکومت پر بیٹھا اور آخر عمر یعنی ۱۲۵ھ تک حکومت کرتا رہا۔ زمانۂ حکومت تقریباً ۱۹ سال سات مہینہ تھا۔ ہشام کی ماں ہشام بن اسماعیل مخزومی کی بیٹی تھی۔

ہشام بنی امیہ کے تیز و تند اور چالاک بادشاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا مقابلہ معاویہ، عبدالملک جیسے چالاکوں سے کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے بخل، بدسرشتی اور تند خوئی کے اعتبار سے شہرۂ آفاق تھا۔ عبدالملک کی اولاد میں چوتھا حاکم اور اتفاق سے احول یعنی بھینگا تھا۔ علویین سے اس کی عداوت کا یہ عالم تھا کہ ہر آن ان کی ایذا رسانی اور ان سے انتقام لینے کی فکر میں غرق رہتا تھا۔

ہشام ایک مرتبہ اپنی حکومت سے پہلے حج کے لئے آیا۔ طوافِ کعبہ کے بعد اس نے ہزار کوشش کی کہ حجرِ اسود کو بوسہ دے لیکن شدتِ ازدحام کے باعث رسائی نہ ہو سکی تو ایک منبر رکھوا کر اس پر بیٹھ گیا۔ منبر کے ارد گرد اہلِ شام کا ایک اجتماع تھا۔ اتنے میں دیکھا کہ امام زین العابدینؑ تشریف لے آئے اور مجمع دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور آپ نہایت ہی سکون و وقار کے ساتھ حجرِ اسود تک پہنچ گئے۔

ہشام یہ منظر دیکھ کر جل گیا اور حقارت آمیز لہجہ میں کہنے لگا کہ آخر یہ کون ہے؟

فرزدق شاعر اس بزم میں موجود تھے، انھوں نے برجستہ کہا کہ انھیں میں پہچانتا ہوں۔

ہشام نے پوچھا یہ کون ہے؟

فرزدق نے قصیدہ شروع کر دیا۔ "یہ وہ ہے جس سے ارضِ بطحا، زمینِ حل و حرم سب واقف ہیں۔ یہ کائنات میں سب سے بہتر اور صاحبِ علم و تقویٰ انسان ہے۔"

ہشام نے یہ سن کر فرطِ غضب سے فرزدق کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

اس کے بعد ایک مرتبہ ہشام نے اپنے زمانۂ حکومت میں ۱۰۶ھ میں حج کیا۔ اس وقت امام محمد باقرؑ مسجد میں موجود تھے۔ آپ کے گرد طلابِ علوم کا ایک مجمع تھا۔ اور آپ اسلامی حقائق

ومعارف کے دریا بہا رہے تھے۔ ہشام اس منظر کو برداشت نہ کرسکا اور اپنے ملازم کے ذریعہ امامؑ سے یہ سوال کرایا کہ لوگ روزِ محشر حساب ختم ہونے تک کیا کھائیں پئیں گے؟

آپ نے فرمایا کہ محشر میں لوگ ایک ایسی زمین پر محشور ہوں گے جہاں درخت ہوں گے، نہریں ہوں گی اور اہلِ محشر ان سے اس وقت تک استفادہ کرتے رہیں گے جب تک حساب ختم نہ ہو جائے گا۔

ہشام کا مقصد اس سوال سے صرف یہ تھا کہ بھرے مجمع میں امام کی توہین کرے۔ اس لئے وہ اس جواب سے بیحد خوش ہوا۔ اس نے سوچا کہ اب ایک موقع ہاتھ آگیا ہے۔ چنانچہ ملازم سے کہلا بھیجا کہ جناب یہ کھانے پینے کی فرصت کسے ہوگی؟ حساب وکتاب کے موقع پر کس کے ہوش بجا رہیں گے؟ آپ نے فرمایا وہی لوگ جو قرآن کی تصریح کے مطابق جہنم میں پہنچ کر اہلِ جنت سے دانے پانی کا تقاضا کریں گے —— ہشام یہ سن کر خاموش ہوگیا اور دل ہی دل میں آلِ محمدؐ کے کمالات کا معترف ہوگیا۔

ایک مرتبہ ہشام حج کے لئے آیا تو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں حضرات موجود تھے۔ امام صادقؑ نے خطبہ پڑھا: "خدا کا شکر کہ اس نے محمدؐ کو نبیٔ برحق بنایا اور ہم کو اپنا برگزیدہ بندہ! ہم اللہ کے نمائندے اور ساری کائنات میں بندگی کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ جو ہمارا دوست ہے وہ نیک بخت ہے اور جو ہمارا دشمن ہے وہ بدنصیب ہے۔" ہشام یہ سن کر اس وقت تو چپ ہوگیا لیکن شام پہنچتے ہی دونوں حضرات کو مدینہ سے بغرض اہانت طلب کر لیا۔

ایک مرتبہ حضرت زید ہشام کے پاس آئے۔ اس نے جوابِ سلام نہ دیا اور نہ گفتگو کی بلکہ سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے بھینگے تجھ پر میرا سلام۔ تو لفظاً امیر پر جواب نہیں دیتا تو یہی لفظ سہی۔

ہشام کو غصہ آگیا اور اس نے بحث شروع کر دی۔ حضرت زید نے بھی غصہ میں تلوار اٹھالی فرمایا کہ "بے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات" آخر ہشام نے انھیں واپس کر دیا اور ان کا مطلب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم جیسے مسلمانوں کے حکام سے کیا کہا جائے۔ اور یہ کہہ کر باہر نکل گئے کہ "جو زندگی کا خواہاں ہوگا وہ ذلیل ہوگا۔ (طبری ج ۸، حوادث ۱۲۱ھ، ابنِ عساکر ۴/۲۳-۲۴)

اس کے بعد حضرت زید کوفہ چلے گئے اور وہاں ایک جہادِ مسلسل کے بعد صفر ۱۲۱ھ میں شہید ہو گئے۔ شہادت کے بعد آپ کے جسم مبارک کو برہنہ کر کے درخت پر الٹا لٹکا دیا گیا۔ ۴ سال تک یوں ہی لٹکا رہا یہاں تک کہ جسم پر مکڑی نے جالا تک بنا لیا۔ (تاریخ خمیس ۲ ۳۲۰) ادھر یوسف بن عمر حاکم کوفہ نے آپ کا سر ہشام کے پاس بھیجا۔ اس نے دمشق کے دروازے پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد مدینے بھیجا گیا اور ایک دن رات تک قبر رسولؐ کے پاس نصب رہا۔ ایک دن کے بعد مسجد میں نیزہ پر نصب کیا گیا۔ لوگ جوق در جوق تماشا دیکھنے آتے تھے اور خطیب افراد آل محمدؐ پر سب و شتم کرتے تھے۔ سات دن تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ (زید شہید مقرم ۱۶۲-۱۶۳) اس کے بعد ہشام نے یہ سر حنظلہ بن صفوان عامل مصر کے پاس بھجوا دیا۔ اس نے بھی کچھ دنوں معلق رکھا اور سارے شہر میں گردش کرایا۔ (النجوم الزاہرہ ۱ ۱۸۱)

حضرت زید کا جسم ولید بن یزید کے دور تک سولی پر لٹکا رہا۔ یوسف بن عمر اس کی نگرانی کا انتظام کرتا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے اتار کر دفن کر دیا جائے۔

یہ یاد رہے کہ جسم کی نگرانی کرنے والا زہیر بن معاویہ صحاح ستہ کا ایک عظیم راوی اور سوادِ اعظم کے مذہب کا ایک ذمہ دار شخص ہے۔ وہ لوگوں سے بیان کرتا تھا کہ میں نے رسولِ اکرمؐ کو خواب میں دیکھا ہے کہ سولی کے پاس کھڑے ہوئے فرما رہے ہیں "ارے کیا میری اولاد کے ساتھ یہی سلوک ہوگا؟ اس کے بعد زید شہید سے خطاب کر کے فرمایا۔ میرے لال ان لوگوں نے تجھے قتل کیا ہے خدا انھیں قتل کرے۔ انھوں نے تجھے سولی دی ہے خدا ان سے انتقام لے۔
(تہذیب تاریخ ابن عساکر ۶ ۳۲۳)

## انکشافِ حقیقت

تاریخ نے ایک افسانہ یہ بھی تیار کیا ہے کہ شیعوں کی ایک جماعت حضرت زید کے پاس آئی اور ان سے شیخین کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے ان کی توقع کے خلاف جواب دیا یعنی شیخین کی مدح کر دی تو سب انھیں چھوڑ کر چلے گئے اور اسی بنا پر ان لوگوں کا لقب رافضی ہو گیا یا اس لئے کہ ان لوگوں نے شیخین کو چھوڑ دیا ہے یا اس لئے کہ زید کو چھوڑ کر چلے گئے۔

لیکن جب اس واقعہ کی تحقیق کی جاتی ہے تو اس کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ منافقوں کی ایک جماعت نے زید کے لشکر میں پھوٹ ڈالنے کے لئے حاکم وقت یوسف بن عمر کے ایماء سے یہ سوال کیا تھا تاکہ ان کے جواب کی آڑ لے کر ان کے لشکر کو منتشر کر دیں۔ جیسا کہ ابن عساکر نے بیان کیا ہے کہ شام کے چاہنے والوں نے زید سے ابوبکر و عمر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ دونوں صحابیوں پر رحم کرے ــــ تم لوگ آج سے پہلے کہاں تھے؟ (تہذیب تاریخ ابن عساکر ۶ ۲۳)

سائل کا مقصد زید کے لشکر میں انتشار کے سوا کچھ نہ تھا اس لئے کہ ان کا لشکر مختلف عقائد کے لوگوں سے مل کر تیار ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر اگر وہ شیخین کی تعریف کریں گے تو ایک جماعت اکھڑ جائے گی اور اگر مذمت کریں گے تو دوسری جماعت برہم ہو جائے گی اور دونوں طرح سے اپنا مدعیٰ حاصل ہو جائے گا۔

استاذ خربوطلی کا بیان ہے کہ یہ یوسف بن عمر کی ایک سازش تھی جس سے اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ (الدولۃ العربیۃ الاسلامیہ)

طبری (۸ ۲۷۲) نے نقل کیا ہے کہ یوسف نے زید کے لشکر میں کچھ جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت زید کا یہ کہنا کہ تم آج سے پہلے کہاں تھے؟ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ وہ خود بھی اس سازش کی طرف متوجہ تھے اور اسی لئے مقتضائے حال کے مطابق ایک جواب دے دیا ورنہ شیعوں کو اس قسم کے سوالات اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ شروع سے زید کے ہم خیال تھے اور ان دونوں کے بارے میں آل محمدؐ کے خیالات سے واقف تھے۔ انھیں نہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت تھی اور نہ فتنہ پردازی کی۔

آخرکار نتیجہ وہی ہوا جو یوسف نے چاہا تھا کہ لشکر میں انتشار پیدا ہو گیا۔ بدعقیدہ لوگ الگ ہو گئے اور صرف چند خالص شیعہ افراد ہی باقی رہ گئے جو آخر دم تک حضرت زید کے ساتھ رہے۔ شیعوں کو رافضی اس لئے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے زید کو چھوڑ دیا ہے بلکہ اس لئے کہا جائے گا کہ ان لوگوں نے زید کے خلاف سازش کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

# ولید بن عبدالملک

یزید بن عبدالملک کا لختِ جگر اور ام الحجاج بنت محمد بن یوسف (برادر حجاج) کا نور نظر۔ ہشام کے بعد ۶ ربیع الاوّل ۱۲۵ھ کو تختِ حکومت پر بیٹھا اور ایک سال دو مہینہ حکومت کرنے کے بعد ۲۸ جمادی الآخر ۱۲۶ھ کو قتل کر دیا گیا۔ ولید کے بارے میں مورخین کے خیالات یہ ہیں:۔

* ابن حزم ـــــ ولید فاسق، بے آبرو اور لغو آدمی تھا۔ (سیرت ابن حزم)
* ابن فضل اللہ صاحبِ مسالک ـــــ ولید اپنے وقت کا فرعون، قوم کا تباہ کرنے والا اور قرآن کریم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والا تھا۔
* قلقشندی ـــــ ولید کا کام لہو و لعب، کھانا، اڑانا اور گانا سننا تھا۔ (الانافہ ا ۱۵۶)
* ابن کثیر ـــــ ولید کھلم کھلا فواحش کا مرتکب ہوتا تھا۔ احکامِ الٰہیہ کی ہتک حرمت کرنے والا اور زندیق تھا۔ ہشام نے ابتدا میں ولید کا احترام کیا لیکن جب اس کی شراب خوری اور لہو و لعب کا علم ہو گیا تو کہنے لگا تو دینِ اسلام پر ہے یا کسی دوسرے دین پر؟ تو نے ہر حرام کو حلال بنا دیا ہے ـــــ؟ اس نے جواب دیا کہ میرا تیرا دین ایک ہے۔

ولید کی بدکرداری عیاں را چہ بیاں ہے۔ وہ قرآنِ کریم کو تیر باراں کرکے کہتا تھا کہ روزِ قیامت اپنے خدا سے کہہ دینا کہ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ تیری آیتیں میرے منشا کے خلاف کیوں نکل آتی ہیں۔ (تاریخ الخمیس ۲ ۳۲۰، ابن اثیر ۵ ۱۴۷، الحور العین صفحہ ۱۹۰)

ولید ہی نے حاکمِ کوفہ یوسف بن عمر کو لکھا تھا کہ زید کا جسم سولی سے اتار کر اسے جلا دے اور خاک کو دریا کے حوالے کر دے۔ جس کے بعد یوسف نے جسم کو نذرِ آتش کرکے خاک کو فرات کے حوالے کر دیا تھا۔ (طبری ۸ ۱۲۲، کامل ۵ ۱۲۷)

ولید کے بارے میں بہت سی روایتیں اس مضمون کی وارد ہوئی ہیں کہ وہ امت کا فرعون ہے۔

امام احمد نے حضرت عمر سے روایت کی ہے کہ ام سلمہ کے بھائی کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔ لوگوں نے اس کا نام ولید رکھا۔ رسول اکرمؐ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ یہ فرعونوں کا سا نام

ہے۔ میری امت میں ایک ولید پیدا ہوگا جو فرعون سے زیادہ مفسد اور مضرت رساں ہوگا۔
بیہقی نے زینب کے ذریعہ ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ میرے پاس اس وقت تشریف لائے جب میری گود میں آل مغیرہ کا ولید نامی ایک بچہ تھا۔ آپ نے اس کا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو فرمانے لگے کہ تم نے یہ نام محبت سے رکھا ہوگا۔ اسے فوراً تبدیل کردو۔ اس لئے کہ اس امت میں اس نام کا ایک فرعون پیدا ہونے والا ہے۔ (ابن کثیر ۱۰ ۶ تاریخ ذہبی ۵ ۱۴۳)
ولید نے حاکم ہوتے ہی لوگوں کے نفع کا اعلان کرا دیا لیکن جب اس کے مظالم زیادہ ہوگئے تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ کاش ہمارے سر ہشام ہی کی حکومت ہوتی اور ہم اس نفع سے محروم ہی رہتے۔
ایک مرتبہ خراسان کے عامل نے ولید کو یہ اطلاع دی کہ حالات ناساز گار ہیں اور انقلاب کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اس نے جواب میں لکھا کہ مجھے عریض معبد اور ابن ابی عائشہ کے گانوں سے فرصت نہیں ہے اور تمھیں انقلاب کی پڑی ہوئی ہے۔ (البدر والتاریخ ۲ ۵۳)
نوبت یہاں تک پہنچی کہ ولید کے چچا زاد بھائی یزید کی قیادت میں ایک جماعت انقلاب کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ اور یزید بن عتبہ نے ولید سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمیں اپنے نقصان کی شکایت نہیں ہے بلکہ شکایت یہ ہے کہ تو نے احکام خدا کی توہین کی ہے۔ شراب نوشی کی ہے۔ سوتیلی ماں سے زنا کیا ہے اور اس طرح دین الٰہی کا استخفاف کیا ہے۔ (تاریخ الاسلام ذہبی ۵ ۱۴۸)
۲۸ جمادی الآخر ۱۲۶ھ کو ولید قتل کیا گیا تو اس کا سر یزید کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے حکم دے دیا کہ اسے شہر شہر پھرایا جائے۔
ولید ہی کے دور حکومت میں حضرت یحییٰ بن زید کا قتل ہوا۔ آپ نے زید شہید کے بعد قیام کر کے خراسان کا رخ کیا۔ ری سرخس ہوتے ہوئے بلخ پہنچے اور وہاں حریش بن عبدالرحمٰن شیبانی کے پاس مقیم رہے یہاں تک کہ ہشام کا انتقال ہوگیا اور ولید تخت حکومت پر قابض ہوگیا۔ (زید شہید مقرم ۱۷۶) یوسف بن عمر نے نصر بن سیار کو لکھا کہ یحییٰ بلخ میں حریش کے گھر مہمان ہیں۔ اس نے حریش کو بلا کر یحییٰ کا مطالبہ کیا۔ حریش نے انکار کر دیا۔ نصر نے انھیں ۶ سو کوڑے لگوائے۔ اس پر بھی حریش نے کہا کہ اگر وہ میرے زیر قدم ہوتے تو میں قدم تک نہ اٹھاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یحییٰ اور

[illegible]

## ابراہیم بن الولید

اپنے بھائی کے بعد ذی الحجہ ۱۲۶ھ میں جعلسازی کر کے تخت نشین ہوا لیکن انقلابات نے اسے چین نہ لینے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ ماہ کے اندر مروان کو حکومت دے کر الگ ہو گیا بلکہ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق مروان ہی نے اسے قتل کرا دیا۔ (مروج الذہب ۳ ۲۳۹، اتانفہ ا ۱۶۱)

## مروان بن محمد

مروان بن الحکم کا پوتا، کردی عورت لبابہ کا بیٹا مروان بن محمد صفر ۱۲۷ھ میں تخت نشین ہوا اور ۱۳ ربیع الآخر ۱۳۲ھ کو بوصیر مصر میں قتل ہو گیا۔ جس کے بعد حکومت بنی امیہ سے بنی عباس کی طرف منتقل ہو گئی۔ اولاد امیہ تلواروں کا نشانہ بنی اور ۹۱ سال ۹ مہینے کی محنت بے سود ثابت ہوئی۔ بنی عباس نے اہلبیت کے حق کا سہارا لے کر مختلف لڑائیاں لڑیں اور آخرکار تخت سلطنت پر قبضہ کر ہی لیا۔ ان کا پہلا حاکم ابوالعباس سفاح تھا جس کی بیعت ربیع الآخر ۱۳۲ھ میں ہوئی اور وہ ذی الحجہ ۱۳۶ھ میں راہی ملک عدم ہو گیا۔

اس کے بعد ابوجعفر منصور حاکم ہوا اور ذی الحجہ ۱۵۸ھ تک تخت نشین رہا۔ اسی دوران ۲۵ شوال ۱۴۸ھ کو امام جعفر صادق کو زہر سے شہید کرا دیا۔ اور آپ کو اس کے مسلسل مظالم سے نجات مل گئی۔

---

# حکامِ مدینہ

آئیے چند لمحوں کے لئے ان اموی و عباسی حکام کا بھی جائزہ لے لیں جن کی حکومت مدینہ منورہ میں تھی۔ اور جن سے امامؑ کا مسلسل سابقہ تھا۔ یوں تو مدینہ بہت سے ظالم و جابر حکام کے زیرِ نگیں رہا لیکن ان میں سرِ فہرست حجاج بن یوسف کا نام آتا ہے۔ جس نے ۷۴ھ میں ابن زبیر کے قتل کے بعد وہاں قیام کیا اور لوگ اس کے خوف سے شہر چھوڑ کر چلے گئے۔
حجاج، صحابہ کرام کی کھلم کھلا توہین کرتا تھا۔ ان کے ہاتھ اور ان کی گردنوں کو سیسے سے داغ دیتا تھا۔
۷۵ھ میں عبد الملک نے اسے مدینہ سے معزول کر کے عراق کا حاکم بنا دیا اور اس کی جگہ ابان بن عثمان عامل ہو گیا۔ ۸۲ھ میں وہ بھی معزول ہوا اور ہشام بن اسماعیل کو حکومت مل گئی۔

## ہشام بن اسمٰعیل ابن ولید مخزومی

۸۲ھ میں عبد الملک ابن مروان کی طرف سے مدینہ کا حاکم ہوا اور ۸۸ھ میں دنیا سے چل بسا۔ آل محمدؐ کی دشمنی، امام زین العابدینؑ کو اذیت پہنچانا، منبروں پر امیر المومنینؑ کو برا بھلا کہنا اس کا خاص شعار تھا۔ عبد الملک نے جب اپنے بیٹے ولید اور سلیمان کے لئے بیعت لینا چاہی تو سعید ابن مسیب نے انکار کر دیا۔ اس نے ہشام کو حکم دیا اور ہشام نے سعید کو ۶۰ کوڑے لگوائے۔ اس کے بعد اونٹ پر بٹھا کر پورے مدینہ میں گردش کرائی۔ یہ واقعہ ۸۵ھ کا ہے۔

لیا۔ چنانچہ خالد کو مکہ اور عثمان کو مدینہ کا حاکم بنا دیا گیا۔

عمر بن عبدالعزیز ہی نے ۸۸ھ میں مسجد پیغمبر کی توسیع کا کام شروع کیا تھا۔ جس کا تاریخی پس منظر یہ تھا کہ ولید نے حج کے موقع پر مسجد پیغمبر سے متصل ایک مکان کی طرف لوگوں کی توجہ دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کا مکان ہے؟

لوگوں نے کہا، یہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کا وہ مکان ہے جس کا دروازہ تمام دروازوں کے بند ہونے کے بعد بھی کھلا رہا۔

ولید کو یہ سن کر غصہ آگیا اور اس نے کہا کہ عجیب! جس شخص پر ہم ہر جمعہ کو لعنت کرتے ہیں اس کا دروازہ مسجد پیغمبر میں رہے گا؟

یہ کہہ کر غلام کو حکم دیا کہ مکان منہدم کر دیا جائے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کیجئے بلکہ شام پہنچ کر تمام شہر مکہ، مدینہ، بیت المقدس وغیرہ کی مسجدوں کی توسیع کا حکم دے دیجئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ علیؑ کا گھر مسجد پیغمبرؐ میں آجائے گا۔ چنانچہ اس نے اس مشورہ کو قبول کر لیا۔ (مختصر تاریخ البلدان ابوبکر بن قتیبہ ص۱۰۴)

ولید نے اس توسیع کے موقع پر عثمان کا گھر نہیں گرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی عباس کے دورِ حکومت میں حسن ابن زید نے دوبارہ توسیع کرا کے عثمان کا گھر بھی گرانے کا ارادہ کر لیا اور منصور کو لکھا کہ اگر مشرقی جانب سے اضافہ کر دیا جائے تو قبر پیغمبرؐ وسط میں ہو جائے گی۔ منصور نے جواب دیا کہ میں تمہارا ارادہ سمجھ گیا۔ دیکھو اب حضرت عثمان کے گھر کا ذکر کبھی نہ کرنا۔ ولید نے مسجد کی توسیع کو اتنی اہمیت دی کہ عمر بن عبدالعزیز کو یہ پیغام بھیجا کہ چاروں طرف کے مکان خرید لئے جائیں اور جو نہ بیچے اس کا گھر گرا دیا جائے۔ (الدرۃ الثمینہ ابن النجار ص۸-۱۰۸) اہلِ مدینہ کو یہ بات ناگوار گذری اور انھوں نے چاہا کہ ازواجِ پیغمبرؐ کے حجرے محفوظ رہیں تاکہ حجاج وزوار ان کی زیارت کر سکیں اور اس سے زہد وتقویٰ کے اثرات پیدا ہوں۔ لوگ یہ سمجھیں کہ مکان بقدر ضرورت ہونا چاہیئے۔ بڑے بڑے مکان فرعونیت اور قیصریت کی علامت ہیں۔ (تاریخ ابن کثیر ۹ ص۷۴) چنانچہ عمر ابن عبدالعزیز نے اس واقعہ کی اطلاع ولید کو دی۔ ولید نے یہ پیغام بھیجا کہ ان باتوں کی پروا نہ کی جائے اور سب گھر گرا دیئے جائیں۔ مزدوروں نے اپنا کام شروع کر دیا تو تمام اشراف مدینہ

نے نالہ وشیون کی آوازیں بلند کردیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی پیغمبر کا انتقال ہوا ہے۔
(تاریخ ابن کثیر ۹ ۷۶)

تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ کے مزدور اس جسارت پر تیار نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ ولید نے چالیس مزدور روم سے اور چالیس قبط سے بلائے تھے۔ (طبری ۸ ۶۵، الدرۃ الثمینہ ۱۸)

# عثمان ابن حیان

ام دردہ کا غلام، جفا جو ظلم شعار اور وہ بادشاہ جس کے دورِ حکومت کا پہلا شاہکار یہ تھا کہ اس نے مدینہ کے بڑے بڑے علماء، امام باقرؑ کے شاگرد اور محمد ابن منکدر جیسے افراد کو صرف اس جرم میں اذیتیں پہنچائیں کہ ان کا شعار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ (تحفہ سخاوی ۲ ۲۸۱)

عراقیوں کو مدینہ سے صرف اس لئے نکال دیا کہ یہ لوگ حجاج کے خوف سے حرم نبوی میں پناہ لیا کرتے تھے۔ عثمان کا کام یہ تھا کہ لوگوں کو گرفتار کرا کے حجاج کے پاس بھیج دے۔ اس نے منبر سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ تم لوگ امیر المومنین کے دور میں خائن رہے ہو۔ عراق والے ہمیشہ کے غدار ہیں۔ میں نے عراقیوں کو ہمیشہ منافق پایا ہے لہذا اگر کسی نے ان کو اپنے گھر میں پناہ دی یا اپنا مکان انھیں کرایہ پر دیا تو اس کا گھر گرا دیا جائے گا اور اسے سخت سزا دی جائے گی۔ (طبری ۸ ۹۲)

# ابوبکر بن محمد

ان کا شمار کتاب صحاح کے راویوں میں ہوتا ہے۔ پہلے مدینہ کے قاضی تھے۔ اس کے بعد عثمان کی جگہ پر حاکم ہو گئے۔ عثمان نے یہ طے کر لیا تھا کہ ابوبکر پر سختی کرے اور ان کا سر اور داڑھی مونڈ دے لیکن سلیمان کا فوری حکم پہنچا کہ حکومت ابوبکر کو ملے اور عثمان کو گرفتار کر لیا جائے۔ ابوبکر ۹۶ھ سے ۱۰۱ھ تک مدینہ کے حاکم رہے۔ اس کے بعد یزید نے ان کو معزول کر کے عبد الرحمٰن ابن ضحاک کو ان کی جگہ حاکم بنا دیا۔ اس نے بھی ابوبکر پر خوب خوب مظالم ڈھائے۔

## عبدالرحمٰن ابن ضحاک

یزید ابن عبدالملک کی طرف سے ابوبکر کے بعد ۱۰۱ھ میں مدینہ کا حاکم ہوا اور ۱۰۴ھ میں معزول ہوگیا۔ اس کی جگہ عبدالواحد نضری کو اس شرط سے ملی کہ عبدالرحمٰن پر ایک ہزار دینار جرمانہ لگائے اور اس کو کوڑوں سے پٹوائے۔ عبدالواحد نے نہایت سعادت مندی سے تمام احکام پر عمل کیا اور اس کے اموال کو اس طریقہ سے لوٹا کہ وہ گلیوں میں بھیک مانگنے لگا۔ عبدالرحمٰن بدسرشت، ظالم اور جفا شعار حاکم تھا۔ اس نے ابوبکر کو بلا وجہ اذیت پہنچائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی بدزبانی کا ہدف اور شعراء کی ہجو کا موضوع بن گیا۔

## عبدالواحد نضری

نضر ابن معاویہ کا پوتا تھا۔ ۱۰۴ھ میں یزید ابن عبدالملک کی طرف سے مدینہ، مکہ اور طائف کا حاکم بنا۔ اور ۱۰۶ھ میں ہشام نے اس کو معزول کر کے اس کی جگہ ابراہیم مخزومی کو دے دی۔ یہ کسی حد تک اہلِ مدینہ کی نظر میں معقول آدمی تھا۔ اپنے ہر کام میں قاسم ابن محمد ابن ابی بکر سے مشورہ کیا کرتا تھا۔

## ابراہیم ابن ہشام

ہشام ابن عبدالملک کا ماموں تھا۔ ۱۰۶ھ سے ۱۱۴ھ تک مکہ، مدینہ اور طائف کا حاکم رہا۔ ۱۱۰ھ میں حج کے موقع پر منیٰ میں ظہر کے بعد سلونی کے دعویٰ کے ساتھ اپنی علمیت کا اعلان کیا تو ایک عراقی نے پوچھ لیا کہ قربانی واجب ہے یا نہیں؟ وہ یہ سن کر چپ ہوگیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

## خالد ابن عبدالملک

۱۱۴ھ میں ابراہیم ابن ہشام کے بعد مدینہ کا حاکم ہوا اور ۱۱۸ھ میں معزول کر دیا گیا۔

اس کی جگہ محمد ابن ہشام کو مل گئی۔ خالد دشمنِ آلِ رسولؐ تھا۔ منبر پر امیر المومنینؑ کے خلاف سخت دسست کہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ داؤد ابن قیس نے سرِ منبر اس کے جھوٹ کا اعلان کیا۔ (ابن عساکر ۵ ۸۲)

## محمد ابن ہشام

ہشام ابن حکم کا ماموں ۱۱۸ھ میں حاکم ہوا اور ۱۲۵ھ میں ولید فاسق نے اسے معزول کر کے اپنے ماموں یوسف ثقفی کو مدینہ کے ساتھ مکہ اور طائف کا بھی حاکم بنا دیا۔ ولید نے ابراہیم و محمد فرزندانِ اسمٰعیل جو سابق میں مدینہ کے حاکم رہ چکے تھے ان کو گرفتار کرا کے یوسف ابن محمد کے پاس بھیج دیا۔ اس نے لوگوں کے سامنے مدینہ میں ان کی تشہیر کی اور اس کے بعد عراق کے عامل یوسف ابن عمر کے پاس بھجوا دیا۔ اس نے اس قدر سختی کی کہ دونوں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

## یوسف ثقفی

یوسف ابن محمد حجاج کا بھتیجا اور ولید کا ماموں۔ ۱۲۵ھ میں ولید کی طرف سے پورے حجاز کا حاکم بنا دیا گیا۔ ولید کے بعد اس کے بیٹے یزید نے بھی ۱۲۶ھ تک اسے حکومت پر باقی رکھا۔ اس کے بعد اسے معزول کر کے اس کی جگہ عبد العزیز ابن عمر ابن عبد العزیز کو دے دی۔ وہ ۱۲۹ھ تک حاکم رہا۔ اس کے بعد مروان الحمار نے اسے معزول کر کے عبد الواحد ابن سلیمان کو حاکم بنا دیا جو مدینہ اور حجاز پر بنی امیہ کا آخری حکمران تھا۔ اسی کے زمانہ میں صفر ۱۳۰ھ میں ابو حمزہ خارجی مدینہ میں داخل ہوا جس کے نتیجہ میں بہت سے افراد قتل کئے گئے اور مدینہ کے ہر گھر سے نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ ابو حمزہ تین مہینے تک مدینہ میں قیام پذیر رہا۔ اس کے بعد مروان الحمار سے جنگ کرنے کے لئے نکلا۔ عبد الملک سعدی کے لشکر نے مزاحمت کی۔ ابو حمزہ کا لشکر ہزیمت خوردہ ہو کر پھر مدینے پلٹ آیا۔ ادھر اہلِ مدینہ نے اس سے مقابلہ کیا اور اس کے

لشکر کو تباہ و برباد کر دیا۔ مدینہ میں عبدالملک ابن محمد ابن عطیہ چند مہینوں تک فاتحانہ انداز سے قیام پذیر رہا۔ اس کے بعد اپنے بھتیجے ولید بن عروہ کو حاکم بنا کر مکہ کی طرف سفر کر گیا۔

---

# تجدیدِ مظالم
# عہدِ بنی عبّاس

ابوالعباس سفاح نے حکومت پانے کے بعد یوسف ابن محمد ثقفی کو معزول کر کے ۱۳۲ھ میں اپنے چچا داؤد ابن علی کو مکہ مدینہ یمن و یمامہ کا حاکم بنا دیا۔

داؤد نے مدینہ میں داخل ہوتے ہی یہ اعلان کر دیا "ایہا الناس! تم کو مہلتوں نے دھوکے میں رکھا ہے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ حکومت کسی سستی سے کام لے گی۔ اب میرے ہاتھ میں تازیانہ ہے۔ میری تلوار نیام سے باہر ہے۔ اب قبیلوں کی تباہی، عورتوں کی بے عزتی اور بچوں کی یتیمی کا وقت آگیا ہے۔

لیکن اسے کیا کیا جائے کہ قضا نے اس کو مہلت نہ دی اور تین مہینہ سے بھی کم حکومت کر کے ربیع الاول ۱۳۳ھ میں دنیا سے چل بسا۔ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے موسیٰ کو جانشین بنایا لیکن سفاح نے اسے ہٹا کر اپنے ماموں زیاد بن عبیداللہ حارثی کو حکومت دے دی جو منصور کے دور تک حکمراں رہا۔

۱۴۱ھ میں منصور نے اسے معزول کر کے زنجیروں میں جکڑ کر کوفہ روانہ کر دیا اور اس کی جگہ محمد ابن خالد قسری کو دے دی۔

۱۴۴ھ میں اسے بھی ہٹا کر ریاح ابن عثمان کو حاکم بنایا۔ یہ ۱۴۵ھ تک رہا۔ اسی کے دور میں محمد ابن عبداللہ بن حسن نے مدینہ میں انقلاب کیا اور ریاح و ابراہیم کو نذر قید خانہ کر دیا۔ ادھر مصعب ابن زبیر کی اولاد میں ایک شخص قید خانہ میں آیا اور اس نے دونوں کو ذبح کر دیا اور

خود محمد کے ساتھ مشغولِ جہاد ہو گیا اور بالآخر قتل ہو گیا۔ اسی سال محمد کے قتل کے بعد عبداللہ ابن ربیع حارثی مدینہ کا حاکم ہوا جو ۱۴۷ھ تک حکمرانی کر کے منصور کی طرف سے معزول ہوا اور اس کی جگہ جعفر ابن سلیمان کو ملی جو ۱۴۹ھ تک حاکم رہا۔ اسی کا دورِ حکومت تھا جس میں امام جعفر صادقؑ کو ۱۴۸ھ میں زہر دغا سے شہید کیا گیا۔

یہ ہیں عہدِ عباسی کے مدینہ کے وہ حکام جن کے ریاح ابن عثمان نے اہلِ مدینہ پر وہ ظلم و ستم کیا کہ آلِ رسولؐ کے مکانات اجڑ گئے اور انھوں نے بجائے مکان کے قید خانہ آباد کر دیا۔ یہاں اذیت رسانی کے ساتھ نہ کسی رحم و کرم کا تصور تھا نہ خوفِ آخرت کا۔ ان تمام مظالم میں سب سے زیادہ الم انگیز اور دردناک وہ منظر تھا جب اولادِ پیغمبرؐ کے بیرو جوان مدینہ کی گلیوں میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے منصور کے جفا شعار لشکر کے گھیرے میں کوڑے لے جائے جا رہے تھے جہاں انھیں جھلسے ہوئے چہروں کے ساتھ قید خانہ کی تاریکی کا مقابلہ کرنا تھا اور آخر کار مصائب کی شدت سے جان بحق تسلیم ہونا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

## امام جعفر صادقؑ کا موقف

مذکورہ بالا حادثات کو دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے مختلف ادوارِ حکومت میں کن کن مصائب کا سامنا کیا اور کس انداز سے اپنی زندگی گذاری جس طرح یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امام کے پیشِ نظر سیاسی و مذہبی اعتبار سے کتنی دشواریاں تھیں۔ زندگی اس عالم میں بسر ہو رہی تھی کہ حوادث کی بہتات اور مظالم کی بھرمار تھی۔ عالمِ اسلام ان مرحلوں سے گذر رہا تھا کہ جہاں نہ کوئی حق پر عمل کرنے والا تھا اور نہ باطل سے روکنے والا۔ خواہشات کے ہاتھ میں حکومت تھی اور بغض و حسد کے قبضہ میں زمام اقتدار۔ مسلمان ان حکام کی سلطنت سے پیسے جا رہے تھے جن کو قرآن و سنت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ امت کے کاندھوں پر حکام کے حرص و ہوس کا بوجھ تھا اور اس کی گردن میں ظلم و جور کے پھندے۔ یہی وہ دور تھا جب سرخ انقلابات اور پامال کن جنگیں وجود میں آ رہی تھیں۔ حکومت کے دعویدار وہ افراد تھے جو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہر خون بہا دینے کو جائز سمجھتے تھے۔

۱۔ امام جعفر صادقؑ کے لئے یہ دور اس لئے بھی انتہائی دشوار تھا کہ آپ کی نشو و نما نبوت کے گھر میں اور آپ کی پرورش وحیٔ الٰہی کی منزل میں ہوئی تھی۔

۲۔ امام صادقؑ نے امامت کا بار اور اسلامی پیغام کی ذمہ داری کو اس انداز سے ادا کیا کہ آپ کی صلاحیتیں اجاگر ہو کر رہیں اور آپ کی شخصیت بہت جلد نمایاں ہو گئی۔ آپ کو ہر انقلاب قیادت کی دعوت دے رہا تھا اور ہر احتجاج اہلبیتؑ کے حق کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھا کہ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ امامت کے واقعی ذمہ دار اور اس کی صحیح منزلِ مقصود یہی افراد ہیں۔

امام صادقؑ نے ان تمام انقلابی اقدامات اور خونریز لڑائیوں کا منظر دیکھ کر اپنے مخصوص حکم و بصیرت سے یہ طے کر دیا کہ اس وقت خاموش دعوت اور اصلاحی اقدام ہی انتہائی مناسب ہے۔ اس لئے کہ انقلابات کا موجودہ رنگ خونریزی کے اضافہ کے علاوہ اور کسی مقصد تک نہیں پہنچا سکتا ہے۔ اب مقابلہ میں انسان نہیں ہیں بلکہ بنی امیہ ہیں۔ امام یہ بھی جانتے تھے کہ ان اختلافات کے نتیجے میں فوجی طاقتوں کے شل ہو جانے کے بعد وہ وقت بھی جائے گا جب اسلامی معاشرہ چیخ اٹھے گا اور اسلامی قوانین، اس کے اجتماعی نظام اور اس کے باہمی تعاون کے اصولوں کی ضرورت محسوس کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے آپ نے شروع ہی سے اصلاحی قدم اٹھایا تاکہ عوام میں فکر و نظر کی صلاحیت پیدا ہو، باہمی تعاون ایجاد ہو اور جاہلیت کے وہ تمام جذبات فنا ہو جائیں جن کو حکومتیں زندہ رکھے ہوئے تھیں۔

یہی وہ ذریعہ ہوگا جس سے ظلم و جور کی بنیادیں متزلزل ہوں گی اور طغیان و سرکشی کے قصر گرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

۳۔ امام صادقؑ کے اس اقدام کا مقصد صرف یہ تھا کہ امت فکر و نظر کی صلاحیتیں پیدا کر کے اس وقت کے لئے تیار ہو جائے جب خونی انقلاب بھی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکے اور اسلامی نظام الٰہی خلافت کے سایہ میں پروان چڑھ سکے۔ امام کی شخصیت میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایسے زبردست معرکہ کے لئے ایک قائد میں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ آپ نے نہایت ہی ثبات و احتیاط کے ساتھ ایک طرف ہر انقلاب اور ہر جنگ و جدل

کی قیادت سے انکار کیا اور دوسری طرف ہر واقع ہونے والی خونریزی کے انجام اور اس انجام سے پیدا ہونے والی ضرورتوں کا حل پیدا کرتے رہے۔

دشواری یہ تھی کہ نہ بنی امیہ کو تختِ حکومت پر دیکھا جا سکتا تھا اور نہ مخالفین ہی کی تائید کی جا سکتی تھی اس لئے کہ مخالفین کا نقصان بھی اسلام کے حق میں بنی امیہ سے کچھ کم نہ تھا اور درحقیقت یہی وہ صورتِ حال تھی کہ جس سے سلامتی کے ساتھ گذر جانے والے انسان کی تاریخ کو قدر کرنی چاہیئے اور اس کی اصابتِ رائے اور جودتِ فکر پر ایمان لانا چاہیئے۔

۴۔ امام صادقؑ کی حیثیت اس مصلح کی تھی جو امت کو اپنے کھوئے ہوئے وقار سے آشنا بنانا چاہتا ہو اور جس کا مقصد یہ ہو کہ عوام اسلامی قوانین کو سمجھیں اور ان کو یہ اندازہ ہو کہ ایسے مفسد و فاسد معاشرہ میں اصلاح کے لئے کن عوامل کی ضرورت ہے۔

ظاہر ہے کہ امام کی تکلیفیں بھی امت کے عام افراد سے زیادہ ہوں گی اس لئے کہ ایسا مصلح اس ظالم حکومت کی نظروں میں ضرور چڑھ جاتا ہے جس کے نزدیک نہ حقوق کا احترام ہو نہ نظم وضبط کا پاس و لحاظ۔ جس کا کاروبار امت پر ظلم، مالِ غنیمت کی جمع آوری، کتاب و سنت کی مخالفت، معاشرہ میں اختلاف، اجتماع میں تفریق اور افکار کو ایسی طرف موڑ دینا ہو جو اسلام کے حق میں انتہائی مضر اور مصلح کے واسطے انتہائی دشوار گذار ہو۔

وہ مصلح جس کی دعوت کا خلاصہ ایک طرف کلمۂ توحید ہو تو دوسری طرف توحید کلمہ۔

امامؑ نے یہ طے کر لیا کہ شرعی فریضہ کی رو سے مجھے اصلاحی پیغام کو بھی نشر کرنا ہے اور حاکمِ وقت کے نظام کے خلاف مخالفت کا اعلان بھی کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ شخص کیا کرتا جس کا حق چھن چکا ہو اور جس کا اقتدار مظلومیت سے بدل چکا ہو۔ لیکن کیا کہنا اس قائد کا کہ اس نے کٹے ہوئے ہاتھوں سے بھی مقابلہ کیا اور لوگوں کو حکومتِ وقت کا ساتھ دینے سے روکا۔ ان کی ملازمت کو ناجائز قرار دیا۔ ان کی اعانت کو گناہِ کبیرہ بتا کر اللہ کا خوف دلایا اور عوام کو یہ سمجھایا کہ انصار و مددگار کے بڑھ جانے سے حکومت میں استحکام اور اس کے ارادوں میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ امامؑ یہ بھی جانتے تھے کہ امت کی حکام سے علیحدگی اور اس کا عدم اعتماد ان کے استقلال

کو کم کرے گا۔ انھیں عدل و انصاف پر مجبور کرے گا اور اس طرح امت اپنے کھوئے ہوئے سکون کو حاصل کر سکے گی۔

ادھر مروانی حکومت کے حکام دنیا میں منہمک، خونریزی میں مشغول، آلِ محمدؐ کی عداوت میں سرگرم اور ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کی ایذا رسانی میں لگے ہوئے تھے مقصد یہ تھا کہ عوام کی نظر کو اہلبیتؑ سے موڑ دیں۔

وہ یہ جانتے تھے کہ دنیا کی محبت اور مال کی خواہش لوگوں کے دلوں میں ہے۔ لیکن یہ سمجھتے تھے کہ عقیدہ ان تمام چیزوں سے بڑی طاقت کا نام ہے۔ آلِ محمدؐ سے محبت دینی بنیادوں پر ہے جو دنیا کے ہر جاہ و حشم پر غالب آجائے گی۔ اسی لئے وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ کسی بزم میں ان کا ذکرِ خیر ہو بلکہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے تھے کہ کسی کو کافر اور کسی کو باغی کہہ کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے جیسا کہ عبداللہ بن عامر عجلی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ جو اموی ہونے کے باوجود صرف اس جرم میں شہربدر کر دیا گیا کہ اس نے حضرت علیؑ پر سب وشتم کی مذمت کر دی تھی۔

بنی امیہ کے بعد ان کی جگہ بنی عباس نے سنبھالی اور اس طرح بانسری میں ایک اور راگ کا اضافہ ہو گیا اور شاعر کو یہ کہنا پڑا "کاش ہم بنی مروان کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے اور بنی عباس کا عدل و انصاف جہنم میں رہتا" عباسیوں نے اولادِ علیؑ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کرایا۔ ان کے گھر گرائے، ان کے آثار مٹائے۔ یہاں تک کہ دورِ متوکل کے شعراء کو کہنا پڑا "خدا کی قسم اگر بنی امیہ نے اپنے نبی کے فرزند مظلوم کو قتل کیا تو ان کے خاندان والوں نے اس سے کم ظلم نہیں کیا۔ انھیں اس بات پر افسوس ہے کہ ہم قتل میں کیوں شریک نہ ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب قبروں کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔

یہ وہ دور تھا جس میں اہلبیتؑ کے سامنے پیش آنے والے مصائب کا شمار نہیں ہو سکتا ہے۔ قید خانے ان سے بھرے ہوئے تھے۔ تختۂ داران کے جسموں پر فخر کر رہا تھا۔ زمین ان کے خونِ ناحق سے رنگین تھی۔ حکومتِ وقت ان کے مخالفین کا ساتھ دے رہی تھی۔ بغداد سے مصر تک یہ قانون نافذ تھا کہ اولادِ علیؑ زمینیں نہ اٹھائیں، گھوڑے پر سوار نہ ہوں، ان کے سفر پر پابندی ہو۔ انھیں صرف ایک غلام رکھنے کی اجازت ہو۔ ان سے اگر کسی سے نزاع ہو تو مخالف

کا قول بلا ثبوت وشہادت کے مان لیا جائے۔ (الولاۃ القضاۃ کندی ص۱۹۸)

ہر آن یہ حکم آتا تھا کہ انھیں چاروں طرف سے اکٹھا کرکے دار الخلافہ تک پہنچا دیا جائے۔ تاکہ ان کی صحیح نگرانی کی جاسکے اور انھیں باقاعدہ سزا دی جاسکے۔

رشید نے اپنے مدینہ کے حاکم کو یہ آرڈر دیا تھا کہ اولادِ علیؑ کو ایک دوسرے کا ضامن بنایا جائے اور سب روزانہ حاضری دیں اور اگر نہ آئیں تو انھیں سزا دی جائے۔

لیکن کیا کہنا اولادِ علیؑ کا کہ مشکلیں برداشت کیں مگر ذلت برداشت نہ کی تکلیفیں اٹھائیں لیکن ظالم نظام کے سامنے سر نہ جھکایا بلکہ عدل وانصاف کا پرچم لے کر ظلم کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ انقلابات ہوئے۔ کامیابی حاصل ہوئی۔ حکومتیں قائم کیں اور بنی عباس کے دلوں کو لرزا دیا چنانچہ وہ ان کے چاہنے والوں کی بھی تباہی وبربادی پر اتر آئے۔ الزامات تراشے گئے۔ عیب نکالے گئے تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ لیکن چاہنے والوں نے مظالم کا مقابلہ ایمان وعقیدہ کے اسلحہ سے کیا اور اس بات پر کمر بستہ ہو گئے کہ آل محمدؐ کے حقوق سے دفاع کرکے رہیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ اکثریت کو خوف وطمع نے حکومت کی طرف کھینچ لیا اور اس کا کام صرف یہ رہ گیا کہ شیعوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرے اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ نجات صرف اسی کے لئے ہے جو ان کی مذمت میں کتاب لکھے یا ان کے خلاف رائے دے یا ان کے عقیدہ پر طنز کرے یا ان کی ہجو میں شعر کہے یا ان کا دشمن مشہور ہو جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ قلم، علماء، شعراء سب آلِ محمدؐ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ بشار ابن برد نے خلیفہ عباسی کے سامنے یہ شعر پڑھ دیا "یہ ناممکن ہے کہ چچا کے بجائے لڑکی کی اولاد میں وراثت چلی جائے" اور اس پر ستر ہزار درہم انعام بھی لے لیا۔

ظاہر ہے کہ جب انعامات کی یہ ارزانی ہو تو صاحبانِ ضرورت اور بخیلی طبیعت کے عوام کس کس انداز سے ضمیر کی تجارت نہ کریں گے چنانچہ مروان ابن حفص نے مہدی کے سامنے یہ قصیدہ پڑھا۔ "کیوں تم لوگ آسمان کے چاند تاروں کی ہوس رکھتے ہو، کیوں اللہ کے قول اور جبرئیل کے پیغام کا انکار کرتے ہو۔ سورۂ انفال کی آخری آیت گواہ ہے کہ وراثت بنی عباس کا حق ہے۔ اب کیوں حق کو باطل کرنا چاہتے ہو!" تو وہ مصلّٰی سے کود کر زمین پر آگیا اور فرطِ مسرت سے یہ سوال کیا کہ اس

قصیدہ میں کتنے شعر ہیں؟ شاعر نے کہا سو۔ مہدی نے حکم دیا کہ اسے سو ہزار درہم دے دیئے جائیں۔ (تاریخ خطیب ۱۲/۱۴۴)

ایک اور شخص رشید کی بزم میں آیا اور اس نے کہا کہ میں نے رافضیوں کی مذمت کی ہے۔ رشید نے شعر سننے کی خواہش کی۔ اس نے ایک شعر پڑھا۔ رشید نے اس کا مطلب پوچھا۔ اس نے مطلب بتانے سے انکار کیا لیکن بہرحال انعام پا گیا۔

مروان ابن ابی الجنوب متوکل کے دربار میں اولاد علیؑ کی مذمت میں شعر پڑھتا ہے تو اس کے سر پر سے تین ہزار دینار نچھاور کر دیئے جاتے ہیں۔ چار خلعت عطا ہوتے ہیں اور بحرین و یمامہ کی حکومت دے دی جاتی ہے۔

یہ وہ مناظر تھے جن سے حکومتِ وقت آلِ محمدؐ کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ ان کا ذکر چھپ نہیں سکتا ہے۔ ان کے آثار مٹ نہیں سکتے ہیں۔ وہ ہدایت کے پرچم اور اصلاح کے داعی ہیں۔ ہر آزاد فکر اور باشعور دور میں ان کی یاد تازہ رہے گی۔

اہلِ انصاف سوچیں کہ ان حالات میں مذہبِ اہلبیتؑ کا عراق، حجاز، مصر، شام، اندلس، ہندوستان، ایران، بحرین، قطیف، پاکستان وغیرہ میں منتشر ہو جانا اس کی ذاتی صلاحیت اور داخلی قوت کے علاوہ کس بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ جب کہ حکومتیں مقابلہ پر کمربستہ اور اس کے مٹا دینے پر آمادہ ہوں۔ ع

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

---

# مذاہبِ اربعہ

## نشر و ارتقاء کے عوامل و محرکات

# تمہید

۱۔ مذاہب اربعہ کے ائمہ کی زندگی سے بحث کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کی نشو و نما کے اسباب کیا تھے اور معاشرہ میں صرف انھیں کا مذہب کیوں رائج ہوگیا؟ ان کے علاوہ دوسرے صاحبانِ فکر و نظر کو استنباط کا کیوں حق نہ دیا گیا؟ فقہ و تشریع کا قافلہ انھیں کی چوکھٹ پر کیوں ٹھہر گیا؟ اجتہاد انھیں کے آستانہ کا دربان کیوں بن گیا؟ امت کی زندگی اور اس کی فکری حیات نے دم کیوں توڑ دیا؟

یہ تمام باتیں اسی وقت معلوم ہوسکتی ہیں جب اس ماحول کا جائزہ لے لیا جائے جس میں مذاہب کی تشکیل ہو رہی تھی اور نئے نئے احکام ڈھالے جا رہے تھے۔

اس کا سبب روحانی طاقت تھی یا سلطنت کا دباؤ؟ یہ مذاہب حکومتوں کی رسائی سے دور تھے یا معرضِ خطر میں؟ ان بزرگانِ دین نے اقتدار کا سر جھکا دیا تھا یا خود سپر انداختہ ہوگئے تھے؟

اموی نظام کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیوں کی کامیابی کا اثر یہ ہوا کہ بنی عبّاس کا ستارہ چمک اٹھا۔ سیاست میں ان کا ایک مقام ہوگیا اور ہر انقلاب میں ان کو قیادت کا درجہ دے دیا گیا۔ بنی امیہ سے انتقام لینے اور اولادِ علیؑ سے محبّت کی آگ بھڑکانے میں فضا انھیں کے نعروں سے گونجی۔ انقلابات برپا ہوئے اور فاتح قوم میں اتحاد کی لہر دوڑ گئی۔ بنی امیہ صفحۂ وجود سے محو ہوگئے اور عباسیوں کو ان کی محنت کا پھل مل گیا۔

اب دل اس بات پر عمل اٹھے کہ آلِ محمدؐ کا عنوان اپنے اوپر منطبق کر لیا جائے تاکہ وراثت کی حکومت اور امت کا اعتماد حاصل کرنے میں سہولت ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ فکر عرب اور وہ بھی مکہ مدینہ کے افراد کے لئے کسی طرح قابلِ قبول نہ تھی۔ وہ آلِ محمدؐ کی صحیح معرفت رکھتے تھے۔ قرآن کی آیتیں اور نبوّت کا طرزِ عمل دیکھ چکے تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ بنی امیہ کے مظالم برداشت کرنے والے آلِ محمدؐ کون سے افراد تھے۔

یہی وجہ تھی کہ عبّاسیوں نے اپنی سیاست کا رُخ موالی اور عجم کی طرف موڑ دیا۔ صرف اس امید پر کہ آج حکومت کے استحکام کا ذریعہ صرف انھیں کو بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد عرب کیا کریں گے۔ "عاقبت کی خبر خدا جانے"۔

۲ - وہ دور جب مدینہ علم کا مرکز اور فتویٰ کا مصدر بنا ہوا تھا۔ اصحابِ رسولؐ، اہلبیتؑ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت تھی جس کی طرف پوری امت اپنے مسائل میں رجوع کر رہی تھی اور جس کا ہر قول ایک لائحۂ عمل کی تشکیل کر رہا تھا۔ بنی امیہ نے پہلے ہی تاڑ لیا کہ آج ساری امت مدینہ کو مرکزِ توجہ بنائے ہوئے ہے اور اسی کو اپنے مشکلات میں مشکل کشا تسلیم کر رہی ہے اس لئے حکومت کو بھی اگر کوئی خطرہ ہے تو اسی مدینہ سے ہے۔ چنانچہ انھوں نے فقہاء کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا اور ان کو بھی دولت کے زور پر کھینچنے لگے۔

عباسی دور میں علمی تحریک تیز تر ہو گئی اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا کہ وہ امامت کو نبوت کا نچوڑ سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ کافر حکومت کے خرابہ پر احکامِ دین اور سنّتِ پیغمبرؐ کی عمارت کھڑی کریں گے۔

ادھر مسلمانوں نے حریت و آزادی کا احساس کرتے ہی اہلبیتؑ کے گرد اجتماع کر لیا تاکہ سرچشمۂ ہدایت سے استفادہ کر سکیں۔ اہلبیتؑ میں اس وقت سب سے زیادہ نمایاں شخصیت امام صادقؑ کی تھی اس لئے چاروں طرف سے طلاب علم آپ کے پاس آنے لگے۔ آپ کے علوم اطرافِ عالم میں پہنچنا شروع ہو گئے اور اس طرح وہ تاریخی مدرسہ قائم ہو گیا جس میں چار ہزار افراد تعلیم پا رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ علمی فروغ اموی حکومت کے کھنڈر پر بلا کسی شرعی جواز کے قائم ہونے والی حکومت کو راس نہ آسکتا تھا کہ اس کی ریاست اولادِ علیؑ کے ہاتھ میں تھی اور بنی عبّاس نے ان کو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نہ چل سکی۔ اختلافات بڑھتے گئے۔ نزاع تیز تر ہوتی گئی اور علماء میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ آپ خود غور کریں کہ نزاع کا ابتدائی انداز کیا تھا اور آخری انجام کیا ہوا۔ بات چلی تھی علم سے اور پہنچی سیاست تک۔

اب حکومت بھی کار آمد پارٹی کی تلاش میں لگ گئی اور اختلاف یہاں تک پہنچا کہ امام مالک ابن انس نے عراقیوں کے خلاف یہ اعلان کر دیا کہ ان کا حکم اہلِ کتاب کا سا ہے۔ (جامع بیان العلم ۲ ۱۵۷) اور جب محمد بن حسن شیبانی یہ سن کر ان کے پاس آئے تو انھوں نے ایک مرتبہ سر اٹھایا اور فرمایا کہ ہمارے اصحاب کا یہی قول ہے۔

عالم یہ تھا کہ آپ عراقیوں کو دیکھ کر یہ آیت پڑھا کرتے تھے: "کفار کی برائی ان کے چہرہ سے ظاہر ہے۔" (ضحی الاسلام ۲ ۱۵۲) اس دور میں کوفہ کا نام ٹکسال گھر پڑ گیا تھا۔ اس لئے کہ یہاں روایت ڈھالنے کا کاروبار تیزی سے چل رہا تھا۔ چنانچہ عطار نے ابوحنیفہ سے یہ کہا کہ تم اس قریہ کے رہنے والے ہو جہاں کے لوگوں نے دینی تفریق پیدا کی ہے۔ (تاریخ بغداد ۱۳ ۴۲۰) تعصب اس حد تک بڑھ گیا کہ اہل مدینہ پر گانے، اہل مکہ پر متعہ کرنے اور اہلِ کوفہ پر نبیذ نوشی کے طعن وطنز چلنے لگے۔ ہر جماعت نے اپنی قوم اور اپنے شہر کے لئے روایتیں گڑھنا شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس نزاع میں کوفہ حجاز کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن سیاستِ وقت کی مصلحت یہی تھی کہ وہ اہلِ رائے کو اہمیت دے۔ ان کی محبت میں نہیں بلکہ اہلِ مدینہ کی عداوت میں۔

اب ہر پارٹی کے اصحاب وانصار پیدا ہو گئے۔ اہلِ حدیث کے سربراہ مالک بن انس اور ان کے انصار میں سفیان ثوری وغیرہ تھے۔ اور اہلِ رائے کے لیڈر ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی عراقی فقہاء۔ شافعی نے مالک سے استفادہ کیا اور احمد نے شافعی سے۔ شافعی تو یہاں تک کہتے تھے کہ اگر میری رائے کے خلاف کوئی روایت مل جائے تو یہ سمجھو کہ وہ روایت ہی میرا مذہب ہے۔ ان کے اصحاب اسمٰعیل بن یحییٰ، ربیع بن سلیمان، حرملہ بن یحییٰ، ابو یعقوب بویطی، ابن صباح، ابن عبدالحکم مصری اور ابوثور وغیرہ تھے۔

اصحابِ رائے میں ابوحنیفہ نعمان بن ثابت اور ان کے اصحاب محمد بن حسن شیبانی، قاضی ابو یوسف، زفر بن ہذیل، حسن بن زیاد، ابو مطیع بلخی، بشر مریسی وغیرہ تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ شریعت

ایک عقلی چیز ہے۔ اس کے کچھ اصول ہیں جن کی بنیاد پر کتاب وسنت کا اعتبار بھی قائم ہے۔ لہذا اپنی رائے سے ہر وقت فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ احکام کے بجائے اس کے علل واسباب تلاش کرتے تھے۔ اور اگر کوئی روایت ان کے فرض کئے ہوئے اصول کے خلاف ہوگئی تو اسے رد کر دیتے تھے۔ غرض اس طرح اہلِ حدیث واہلِ رائے یا اہلِ مدینہ وکوفہ کے عنوان سے۔ امت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ حالانکہ اہلِ عراق حدیث میں مدینہ والوں سے کسی طرح بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا سارا کاروبار رائے وقیاس پر چل رہا تھا۔ اور یہی ان کی علمی تحریک کا فروغ ونشاط تھا۔

علمی تحریکات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور ہر شہر میں ایک بانیٔ مذہب امام پیدا ہوگیا۔ یہ اور بات ہے کہ مقدر نے بقاء ودوام ہر ایک کی قسمت میں نہیں لکھا تھا اس لئے اکثریت فنا کے گھاٹ اتر گئی اور باقی ماندہ تاریخ کا شاہکار بن گئے۔ انھیں اپنے معاصرین پر فوقیت ملنے لگی اور وہ ریاست نصیب ہوگئی کہ فقہ کے قافلہ نے ان کے زیر سایہ پناہ لی۔ استنباط ان کی چوکھٹ پر آکر ٹھہر گیا اور اب مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی، صرف چار ہی مذہب رہ گئے۔

صفحۂ وجود سے مٹ جانے والے مذاہب کی تفصیل یہ ہے :-

مذہب سفیان ثوری متوفی سنہ ۱۶۱ھ۔

مذہب سفیان بن عیینہ متوفی سنہ ۱۹۸ھ۔

مذہب حسن بصری متوفی سنہ ۱۱۰ھ۔

مذہب اوزاعی متوفی سنہ ۱۵۷ھ۔

مذہب محمد بن جریر متوفی سنہ ۳۱۰ھ۔

مذہب عمر بن عبد العزیز متوفی سنہ ۱۰۱ھ۔

مذہب اعمش متوفی سنہ ۱۴۸ھ۔

مذہب شعبی متوفی سنہ ۱۰۵ھ۔

مذہب اسحٰق متوفی سنہ ۲۳۸ھ۔

مذہب لیث متوفی سنہ ۱۷۵ھ۔

مذہب ابی ثور متوفی سنہ ۲۴۰ھ۔

مذہب داؤد ظاہری متوفی ۲۷۰ھ۔
مذہب عبداللہ بن اباض

(تاریخ الفتح العربی فی لیبیا ص ۱۰۶)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مذاہب تھے جو آپس میں بعض مسائل میں متحد اور بعض میں مختلف تھے جیسے مذہب عائشہ، مذہب ابن عمر، مذہب ابن مسعود، مذہب ابراہیم نخعی وغیرہ ۔ ان مذاہب کو سمجھنے کے لئے اربابِ مذہب کی مختصر داستان بیان کرنا ضروری ہے ۔

سفیان ثوری ــــ ابوعبداللہ سفیان بن سعید بن مسروق کوفی ۔ ۶۵ھ یا ۶۶ھ میں متولد ہوئے اور ۱۶۱ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ نشوونما کوفہ میں ہوئی۔ ان کا خانوادہ علم وفضل کے اعتبار سے ایک عام شہرت کا مالک اور مرجع فقہاء وعلماء تھا۔ منصور نے آپ کو قتل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ اس نے قاضی بنانا چاہا لیکن آپ نے گریز کیا۔ ابن قتیبہ نے آپکا شمار شیعوں میں کیا ہے۔ اپنے وقت کے بڑے مجتہد اور مسلمانوں کے امام تھے۔ آپ سے بیس ہزار حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ حکومتِ وقت کی ہمراہی نہ ہونے کے باعث آپ کا مذہب بھی چوتھی صدی کے بعد نہ چل سکا اور خود بھی مخفیانہ زندگی گزارتے رہے یہاں تک کہ اسی عالم میں رحلت کر گئے۔

سفیان بن عیینہ ــــ امام جعفر صادقؑ، زہری، ابن دینار، ابو اسحٰق کے شاگرد شافعی اور شعبہ بن حجاج وغیرہ کے شیخ تھے۔ ۱۹۸ھ میں دنیا سے انتقال کیا۔

شافعی کا خیال تھا کہ فتویٰ کے معاملہ میں سفیان سے زیادہ محتاط اور جری نہیں دیکھا گیا۔ اگر مالک وسفیان نہ ہوتے تو حجاز میں علم ہی نہ ہوتا۔ آپ کا مذہب بھی حکومتِ وقت کی ہمراہی نہ حاصل ہونے کے باعث چوتھی صدی میں ہی ختم ہو گیا۔ آپ کا مدفن مکہ معظمہ میں ہے۔

حسن بصری ــــ ابوسعید حسن بن ابی الحسن بصری متوفی ۱۱۰ھ ۔ زید بن ثابت انصاری کے غلام اور حضرت ام سلمہ کی کنیز کے لختِ جگر اور نورِ نظر تھے ۔

وادئ قریٰ میں نشوونما پائی ۔ اہلِ بصرہ کے حسین ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔ حکام سے خاصے تعلقات تھے اس لئے حکومت کی امداد بھی حاصل تھی۔ حکومت بھی انھیں ایک لشکرِ جرار سے زیادہ کارآمد سمجھتی تھی۔ یہاں تک کہ تاریخ کا فقرہ ہے کہ "اگر حسن بصری کی زبان اور حجاج ثقفی کی تلوار

نہ ہوتی تو مروانی حکومت زندہ درگور ہو جاتی اور اسے اس کے آشیانہ میں کبھی پناہ نہ ملتی "۔ حدیثوں میں میل آپ کا خاص مشغلہ تھا۔ بنی امیہ کی سیاست سے ہم آہنگی کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت علیؑ کا نام نہ لیتے تھے اور ان کی روایتیں ابوزینب کے نام سے نقل کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت علیؑ کے بارے میں گستاخی کی تو ابان بن عیاش نے ٹوک دیا۔ کہنے لگا کہ میں حکومت سے اپنی جان بچانے کے لئے یہ باتیں کرتا ہوں۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک امام مذہب بھی تقیہ کو اس انداز سے استعمال کرتا ہے۔ معتزلی مذہب کی بنیادیں آپ ہی کی مجلس سے شروع ہوئی تھیں۔

**اوزاعی** ـــــ شامیوں کے امام عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی۔ شام میں ان کا مذہب اتنا ہی عام تھا جتنا حجاز میں مالک اور عراق میں ابوحنیفہ کا مذہب تھا۔ شام کے بعد اندلس میں شہرت ہوئی لیکن محمد ابن عثمان شافعی کے قاضیٔ دمشق ہونے کے بعد ہی مذہب شافعی نے اس کی جگہ لے لی۔ اوزاعی کا مذہب ۳۰۲ھ تک باقی رہا۔ بنی امیہ کی نظر میں اس کا اچھا خاصا وقار تھا۔ اس لئے کہ حکومت ایسے ہی اشخاص کی تلاش میں رہتی تھی جو سیاست کو مذہب کا رنگ دے سکیں۔ عباسی دور میں بھی ان کی اہمیت باقی رہی اس لئے کہ حکومت کو اہلِ شام کی مخالفت سے خطرہ تھا۔ منصور بھی آلِ محمدؐ سے انحراف کی بنیاد پر ان کی کافی قدر کرتا تھا۔ ان کی علمی صلاحیت کا سکّہ جما ہوا تھا کہ امام مالک آپ کو ابوحنیفہ اور سفیان ثوری پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کا انتقال بھی حمام میں پیش آیا اور وہ بھی زوجہ محترمہ کی آتش فشانی سے۔

**ابن جریر طبری** ـــــ ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید بن خالد بن غالب طبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۶ شوال ۳۱۰ھ کو بغداد میں رحلت فرمائی۔ بڑے زبردست مجتہد تھے۔ ابن طراز کے خاص مریدوں میں تھے۔ محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کو روئے زمین کا سب سے بڑا عالم سمجھتے تھے۔ خطیب بغدادی کی نظر میں یہ کتابِ خدا کے حافظ، قرآن کے معنی و مطالب کے عارف، احکام خدا کے فقیہ، سنّتِ پیغمبرؐ کے عالم صحیح و ضعیف، ناسخ و منسوخ سے واقف، صحابہ و تابعین کے ارشاد سے باقاعدہ باخبر تھے۔

**ظاہری** ـــــ ابوسلیمان داؤد بن علی بن خلف ظاہری۔ ۲۰۲ھ میں کوفہ میں پیدا

ہوئے۔ بغداد میں نشوونما ہوئی۔ اور وہیں ۲۷۰ھ میں رحلت فرمائی۔ ظواہر پر عمل کرنے کا خاص شوق تھا۔ ساتویں صدی تک یہ مذہب چلتا رہا جس کے بزرگوں میں عبدالحق اشبعلی متوفی ۵۸۱ھ۔ محمد بن حسین میورقی۔ مجدالدین عمرو بن حسن محدث متوفی ۶۳۳ھ۔ محمد بن حزم صاحب کتاب الفصل و کتاب المحلیٰ تھے۔ ابن حزم زبردست حافظہ کا مالک اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا۔ علماء پر طعن و طنز اور بدزبانی میں کامل مہارت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ مشہور ہوگیا تھا کہ ابن حزم کی زبان اور حجاج کی تلوار دو بہنیں ہیں۔

ابن عربی کا کہنا ہے کہ یہ شروع میں شافعی تھا۔ پھر ظاہری کے مذہب میں آیا اور آخر میں مستقل امام بن بیٹھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ۳ ۳۲۳) ظاہری مذہب نے بہت زیادہ شہرت پیدا کی۔ اور یعقوب بن یوسف کے والیٔ مغرب ہونے کے بعد اس کا دائرہ وسیع تر ہوگیا۔ یعقوب شروع میں مالکی تھا لیکن بعد میں ظاہری ہوگیا اور ہر شخص کا فریضہ ہوگیا کہ ظاہری مذہب اختیار کرے۔ فقہاء کی زبانیں بند ہوگئیں۔ سطوتِ سلطانی نے کام و دہن میں قفل ڈال دیئے۔ مذہب مالکی کی ساری کتابیں مثل مدونہ سحنون، کتاب ابن یونس، نوادر ابن ابی زید، تہذیب بردعی سب جلا دی گئیں۔ مقدسی نے اپنی کتاب احسن التقاسیم میں ظاہری مذہب کو پانچواں مذہب شمار کیا ہے۔

**لیث بن سعد** ـــ ۹۲ھ میں متولد ہوئے اور ۱۵ شعبان ۱۷۵ھ میں انتقال کرکے قرافہ میں دفن ہوئے۔ شافعی ان کو مالک سے زیادہ فقیہ سمجھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کا مذہب نہ چل سکا۔ ابن وہب شافعی سے لیث کے مسائل پڑھتے تھے۔ ایک مسئلہ میں ایک شخص نے مالک اور لیث کا موازنہ کیا تو ابن وہب نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے لیث سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا ہے۔ اہلِ مصر حضرت عثمان کی مذمت کرتے تھے۔ لیث نے ان کے درمیان حضرت عثمان کے فضائل نشر کئے لیکن مقدر میں بقا نہ تھی اس لئے مذہب نہ چل سکا۔

استاد احمد امین کا کہنا ہے کہ کاش اہلِ مصر اپنے علماء اور مفکرین کی قدر کرتے لیکن افسوس کہ گھر کی مرغی دال برابر! درحقیقت لیث کے مذہب کی ناکامیابی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے حکومتِ وقت سے ساز باز نہیں کی۔ منصور نے قضاوت کے لئے بلایا تو نہ خود گئے نہ اپنے کسی شاگرد کو بھیجا۔ حالانکہ درحقیقت یہی عہدہ مذہب کی بقاء کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی رشید سے

ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ تمھارے شہروں میں مصلحت کس بات میں ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ نیل کے بہاؤ اور امیر کی شرافت میں۔ اس لئے کہ کدورت چشمہ ہی سے آتی ہے۔ اگر سرچشمہ صاف ہوگا تو پانی بھی صاف ہی ملے گا۔

نجوم زاہرہ میں لیث کو مصر والوں کا رئیس و امیر اور تمام حکام کا حاکم تصور کیا گیا ہے۔ امام شافعی کو آپ کی ملاقات نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا۔

**عمر بن عبد العزیز**۔۔۔ جلیل القدر تابعی تھے۔ انس بن مالک وغیرہ سے روایت کرتے تھے اور بنی امیہ میں سب سے زیادہ معقول آدمی تھے۔ آپ کی زندگی کا مفصل تذکرہ سابق میں ہو چکا ہے لیکن آپ کے مذہب کی تفصیلات تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

**اعمش**۔۔۔ سلیمان بن مہران اعمش کوفی متوفی ۱۴۸ھ۔ ان کا مقابلہ زہری جیسے بزرگوں سے ہوتا تھا۔ انھوں نے انس بن مالک کو دیکھا ضرور ہے لیکن ان سے حدیث نہیں سنی ہے بلکہ ان کے اصحاب کے ذریعے ان سے روایت کی ہے۔ انتہائی پرلطف اور مزاح پسند تھے۔ سفیان و شعبہ وغیرہ ان سے حدیثیں نقل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ابو حنیفہ آپ کی عیادت کو گئے۔ کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اٹھتے وقت معذرت کی کہ میں آپ کے لئے کافی گراں بار ثابت ہوا۔ تو اعمش نے جواب دیا کہ آپ میری نظر میں اپنے گھر میں رہ کر بھی گراں بار ہی رہتے ہیں۔

ایک دوسری جماعت عیادت کے لئے آگئی، وہ بھی کافی دیر بیٹھ گئے۔ آپ کو غصہ آگیا اپنا تکیہ سنبھالا اور یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ خدا آپ لوگوں کے مریض کو عافیت کے ذریعہ شفا دے۔

عاشور محرم کے دن پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں جس سال امام جعفر صادقؑ کا انتقال ہوا اسی سال رحلت کی۔ معارف ابن قتیبہ میں ہے کہ صرف سات مہینے شکم مادر میں رہے۔

**شعبی**۔۔۔ ابو عمر۔ عامر بن شرجیل متوفی ۱۰۵ھ۔ اپنے ہی قول کے مطابق پانچ سو صحابہ کرام کے ساتھ رہے۔ کوفہ کے محدث اور عمر بن عبد العزیز کے قاضی تھے۔ رائے اور قیاس سے کنارہ کشی کر کے روایتوں کی بنیاد پر فتویٰ دیتے تھے اور اسی فتویٰ کے طفیل بانی مذہب قرار پا گئے تھے۔

یہ بعض افراد تھے جن کے مذہب کو اہمیت دی گئی ہے ورنہ ایسے مذہب تو پچاس سے

بھی کہیں زیادہ ہیں۔ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ان مذاہب کی تحقیق کریں یا ان کی تاریخ لکھیں۔ ہمیں تو صرف ان اسباب کی تلاش کرنا ہے جن کی بنا پر یہ مذاہب صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور سارا دین چار ہی مذہبوں میں منحصر ہو گیا۔ جب کہ دیگر مذاہب کے علماء بھی خاصی اہمیت کے مالک تھے۔ بلکہ بعض تو چاروں سے بڑے عالم تھے جیسے سفیان ثوری کہ جو شعبہ اور ابو عاصم کی نظر میں سید الحفاظ اور حدیث کے امیر المومنین تھے۔ ابن مبارک کے نزدیک ہزار شیوخ احادیث سے بہتر تھے۔ قطان کی نظر میں مالک سے بلند درجہ کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود مذاہب چار ہی رہ گئے اور ان سب کا نام ونشان تک مٹ گیا۔

کیا کہنا اہلبیتؑ کے چاہنے والوں کا کہ ان کے اصول و فروع، ان کے عقائد و مسلمات نہ سیاست سے مرعوب ہو سکے اور نہ حکام کی دخل اندازی کو قبول کر سکے۔ مذہب میں تقیہ ضرور کیا حکومت وقت کی بعض اوقات کھلی ہوئی مخالفت نہیں کی لیکن یہ سب بھی ایک خاص مصلحت کے تحت تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مذہب کو خون بہانے سے زیادہ خون بچانے کی ضرورت ہے۔ یہ وقت اس کے ضعیف و ناتواں جسم میں خون پہنچانے کا ہے خون نکالنے کا نہیں ہے۔

---

# مذاہب کی شہرت کے اسباب

# مذہبِ حنفی

چونکہ بنی عباس کی حکومت کی بنیاد پیغمبرِ اسلام سے رشتہ داری پر قائم تھی۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ خاندانی قرابت کی بنا پر ہم بنی امیہ جیسے دشمنانِ اسلام اور اعدار رسالت سے زیادہ حکومت کے مستحق ہیں اس لئے فطری طور پر ان کی یہ خواہش تھی کہ ایک ایسی حکومت قائم کریں جس میں دین و دولت، مذہب و حکومت کا چولی دامن کا ساتھ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں نے علمار سے تعلقات پیدا کئے۔ اربابِ دیانت کو مقربِ بارگاہ بنایا۔ عراق کے اہلِ رائے منصب قضاۃ پر فائز کئے گئے۔ ابو یوسف کو قاضی القضاۃ بنایا گیا اور یہی وہ بات تھی جس سے حنفی مذہب نے بے انتہا شہرت حاصل کرلی۔ ابو یوسف، ابو حنیفہ کے شاگرد اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ رشید کے زمانہ میں ۱۷۰ھ میں قضاوت عام کے منصب پر فائز ہوئے اور پھر سارا عراق، خراسان، شام اور مصر انھیں کے اشاروں پر رقص کرنے لگا۔ (خطط مقریزی ج ۲ ص ۱۴۴)

رشید کا یہ عالم تھا کہ وہ ابو یوسف سے کہا کرتا تھا کہ اگر میرے امکان میں ہوتا تو تمھیں اپنے نسب اور اپنی خلافت دونوں میں شریک کرلیتا اس لئے کہ تم اس کے اہل ہو۔ (مکافات ابن دایہ ص ۱۳۰) اس محبت کا سبب یہ تھا کہ ہادی نے ایک مرتبہ رشید کو معزول کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں ابو یوسف سے مشورہ کیا تو ابو یوسف نے اس رائے کی مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مورخین کی رائے کے مطابق کوئی عالم کسی بادشاہ پر اس انداز سے مسلط نہیں ہوا جس طرح کہ ابو یوسف کو رشید پر تسلط حاصل ہوا۔

بشر مریسی کا کہنا ہے کہ میں نے سلطنت کے کسی مرتبہ کی کوئی خواہش نہیں کی سوائے اس ایک مرتبہ کی جس پر ایک رات میں ابو یوسف کو فائز دیکھا تھا۔ (مکافات ص۶۲-۶۳) احمد بن یوسف کاتب کا خیال ہے کہ ابو یوسف رشید کے ساتھ اس منزل پر تھے جس پر نہ کوئی عالم پہنچا ہے نہ عشوق۔ (مکافات ص۱۱۶ و ص۱۷۳)

ابن عبد البر نے انتقاء کے ص۶ پر یہ لکھا ہے کہ ابو یوسف، مہدی، ہادی اور رشید تینوں کے دور میں قاضی القضاۃ رہے۔ رشید ان کا بے حد احترام کرتا تھا اور اسی احترام و اقتدار کا اثر تھا کہ انھوں نے مذہب حنفی کو شہرۂ آفاق بنا دیا۔

جب ہم اس مذہب کی بنیادی طاقتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترقی ان چار آدمیوں کی ممنونِ احسان ہے جنھوں نے ان کے مسائل کو مرتب کیا تھا۔ ابو حنیفہ تو صرف کبھی کبھی ان لوگوں کے شریک ہو جایا کرتے تھے۔

ان میں پہلے ابو یوسف ہیں جنھوں نے ترویج مذہب کے لئے کتابیں لکھیں، مسائل مرتب کئے، فقہ حنفی میں حدیثوں کو داخل کیا اور ہارون رشید کے لئے مالکی مذہب کے مطابق کتاب الخراج تالیف کی۔

دوسرے محمد بن حسن شیبانی متولد ۱۳۲ھ متوفی ۱۸۹ھ۔ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ عباسی حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھے اور ابو حنیفہ کو دیکھا مگر کم سنی کی وجہ سے ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ابو یوسف سے مسائل سیکھے اور اپنی ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے اہلِ رائے کے مرجع بن گئے۔ مذہب میں کچھ کتابیں تالیف کیں جو آج تک احناف کا قدیم سرمایہ ہے۔ مدینہ میں مالک سے موطا پڑھی اور گھر آکر اپنے مذہب کو موطا پر منطبق کیا۔ خود ابو حنیفہ سے بھی اکثر مسائل میں اختلاف کیا ہے۔

تیسرے زفر بن ہذیل متولد ۱۱۰ھ تھے جن کا شمار اہلِ حدیث میں بھی تھا، اور اصحاب ابو حنیفہ میں سب سے زیادہ قیاس بھی کرتے تھے۔

چوتھے حسن بن زیاد لولوئی تھے جنھوں نے ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد تینوں کی شاگردی کی مذہبی کتابیں بھی لکھیں لیکن احناف کے نزدیک شیبانی جیسا اعتبار نہ پیدا کر سکے۔

یہی چار افراد ہیں جو حنفی مذہب کے عناصر اربعہ کہے جا سکتے ہیں کہ تاریخ نے فقہ و مسائل کے

سلسلہ میں خود ابو حنیفہ کی کسی کتاب کا پتہ نہیں دیا ہے۔ صرف عقائد میں ایک کتاب فقہ اکبر تھی جس میں صرف چند ورق تھے اور بعد میں کافی اضافات کئے گئے۔ جب کہ اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہ بھی ابو حنیفہ بخاری کی کتاب ہے نہ کہ امام ابو حنیفہ کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود ابو حنیفہ کا اپنے مذہب کی نشر و اشاعت میں کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ ان کے فتوی کبھی ابراہیم اور عبدالرزاق سے عام طور پر ہم آہنگ ہوا کرتے تھے۔ (ان چاروں حضرات کی امتیازی صفت یہ ہے کہ ابو یوسف کو ابن مبارک نے مہمل، یزید بن ہارون نے ناقابلِ برداشت اور غاصب قرار دیا ہے۔

شیبانی کو یحییٰ بن معین نے جھوٹا، مرہ نے کذاب اور منصور ابن خالد نے بے اعتبار قرار دیا ہے۔ (لسان المیزان ۵ ۱۲۱، وفیات الاعیان)

حسن بن زیاد کو یحییٰ بن معین اور ابو داؤد نے جھوٹا، ابن مدینی نے بے اعتبار، ابو حاتم نے غیر موثق، دارقطنی نے ضعیف و متروک، محمد بن حمید رازی نے بدنما، خطیب نے نافہم، وکیع نے بے برکت اور منحوس قرار دیا ہے۔ ع مذہب معلوم و اہلِ مذہب معلوم)

---

# مذہبِ مالکی

اہلِ عراق و اہلِ مدینہ یعنی اہلِ حدیث و اہلِ رائے کے باہمی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوحنیفہ کا نام عراق میں چمک گیا اور مالک کا نام حجاز میں۔

حکومت سراسر ابوحنیفہ کی حمایتی تھی اور عجم کو عرب سے آگے بڑھا رہی تھی۔ اسی لئے مالکی حضرات کو ہر آن حکومت سے خطرہ لگا رہتا۔ امام مالک امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد ہونے کے علاوہ اولادِ علیؑ کی طرف میلان بھی رکھتے تھے۔ جناب محمد کے ساتھ انقلاب کو واجب قرار دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی توہین بھی کی گئی اور ان کو تکلیفیں بھی پہنچائی گئیں اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جماعت ان کی ہمدرد بن گئی اور اس طرح معاشرہ میں انھیں بہت بڑا درجہ مل گیا۔ حکومت کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان پر بھی نظرِ عنایت کرے تاکہ ان کے ذریعہ سے بھی عوام پر اقتدار مستحکم ہو سکے۔ چنانچہ امام شافعی کا بیان ہے کہ جب وہ مدینہ پہنچے اور والئ مکہ کا خط والئ مدینہ کا نام جس میں شافعی کی سفارش اور ان کے مالک تک پہنچا دینے کا ذکر تھا، والئ مدینہ کو دیا تو اس نے پڑھ کر کہا کہ مدینہ سے مکہ تک پیدل چلا جانا میرے لئے آسان ہے لیکن مالک بن انس کے دروازہ پر جانا مشکل ہے۔ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ شافعی نے کہا کہ اگر مناسب سمجھیں تو انھیں کو بلا لیجئے۔ والئ مدینہ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں مع اپنے اصحاب کے خود جاؤں تو شاید کام ہو جائے۔ غرض شام کے وقت سب گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک شخص نے زنجیر کھٹکھٹائی تو ایک سیاہ فام کنیز نکلی۔ امیر نے اس سے کہا اپنے مولا کو میرے آنے کی خبر کر دو۔ وہ اندر گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آئی اور کہنے لگی کہ آقا نے بعد سلام

یہ کہا ہے کہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو پرچے پر لکھ کر بھیج دو اور اگر کوئی حدیث ہے تو نشست کے وقت آنا۔ امیر نے کہا کہ میرے پاس والی کا بہت ضروری خط ہے۔ کنیز اندر گئی اور ایک کرسی لے آئی۔ اب امام مالک گھر سے برآمد ہوئے تو ان کے چہرے سے جلالت کے آثار نمایاں تھے۔ (معجم الادباء ۱۷، ۲۷۵)

مالک کے حالات دونوں دور میں مختلف نظر آتے ہیں۔

ایک دور وہ تھا جب ان پر حکومت کا عتاب تھا۔ انھیں کپڑے اتروا کر ۷۰ کوڑے لگوائے جاتے تھے اور ایک دور یہ ہے کہ حاکم میں بات کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کی روش مذہب کے ساتھ ایک نہیں رہتی ہے بلکہ ہر شخص ارباب مذہب پر قابو پانے کے لئے نیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

مالک کا ستارہ عباسی افق پر چمک گیا اور اب ان کی شخصیت ربیعہ جیسے استادوں سے بھی آگے بڑھ گئی۔ عباسیوں نے انھیں مرجع خلائق بنا دیا، لیکن حکومت کی یہ مہم بھی اس وقت ناکام ہو گئی جب منصور نے ان سے ایک ایسی کتاب لکھنے کا تقاضا کیا جس پر لوگوں کو زبردستی عمل کرایا جائے۔ اور انھوں نے انکار کر دیا۔ منصور نے یہ کہا کہ یہ کتاب تمھیں لکھنا پڑے گی۔ اس لئے کہ تم سے زیادہ اعلم کوئی نہیں ہے۔ جس پر انھوں نے موطا لکھ دی۔ (شرح موطا زرقانی ۱ ص) ظاہر ہے کہ اس اعلمیت کا کیا اثر ہونا چاہئے اور امت اس سے کیوں کر منحرف ہو سکتی تھی۔ ادھر عامل مدینہ کو رشید کا یہ حکم تھا کہ بغیر مالک کے کوئی کام نہ کریں اور خود بھی مالک کے سامنے زمین پر بیٹھ کر حدیث سنا کرتا تھا۔ (مناقب مالک ) ظاہر ہے کہ مالک کی شہرت کی کیا انتہا ہو سکتی ہے۔ جب حج کے زمانہ میں بادشاہ کا منادی یہ ندا دے رہا ہو کہ فتویٰ دینے کا حق صرف مالک کو ہے۔ اب انھیں کی شخصیت ہے، انھیں کی ہیبت ہے، انھیں کے گرد اجتماع ہے اور انھیں کی طرف تقرب کی خواہش تمام ہو رہی ہے۔ حدیث کے لئے وقت اور دن مقرر ہو گیا ہے۔ کاتب مسائل سنا رہا ہے۔ نہ کسی میں قریب آنے کی جرأت ہے نہ کتاب دیکھنے کی ہمت ہے اور نہ بات کرنے کی طاقت ہے۔ اعتراض تو بہت بڑی بات ہے۔

اسمٰعیل فزاری کا بیان ہے کہ میں نے مالک سے احادیث کا مطالبہ کیا تو انھوں نے بارہ حدیثیں بیان کیں۔ میں نے مزید خواہش کی تو اپنے سرہانے کھڑے ہوئے حبشیوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ (انتقاء ۲، ۴۲)

اس مقام پر مالک کے بارے میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے احادیثِ پیغمبرؐ اور ارشاداتِ شریعت کے بیان کرنے میں بخل سے کام کیوں لیا۔ ان جیسے حضرات کے لئے یہ بات انتہائی عجیب ہے۔

ابوبکر بن عبداللہ صنعانی کا بیان ہے کہ میں امام مالک کے پاس آیا۔ انھوں نے ربیعہ کی روایتیں بیان کیں۔ میں برابر زیادتی کا مطالبہ کرتا رہا۔ ایک دن کہنے لگے کہ تمھیں ربیعہ سے کیا کام ہے۔ وہ دیکھو اس کمرے میں سو رہا ہے۔ میں ربیعہ کے پاس آیا اور میں نے کہا کہ امام مالک تو تمھارے ذریعہ سے مزے اڑا رہے ہیں۔ اور تمھاری یہ حالت ہے۔ ربیعہ نے جواب دیا کہ دولت کا ایک ذرہ علم کے ایک بوجھ سے بہتر ہوتا ہے۔ (طبقات الفقہا، ابن اسحٰق ص۴۲) بہرحال مقدر نے امام مالک کا ساتھ دیا۔ ان کو عظمت حاصل ہوئی، ان کا مذہب مقبول ہوا اور ان کی کتاب کو ایک درجہ مل گیا۔ یہاں تک کہ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ زمین پر کتابِ خدا کے بعد مالک کی کتاب سے بہتر یا قرآن سے قریب تر کوئی اور کتاب نہیں ہے۔

مذہب مالکی کی شہرت بھی قاضیوں اور بادشاہوں کے طفیل میں ہوئی۔ اندلس میں بادشاہ نے صرف اس بنیاد پر اسے قانونی مذہب بنا دیا کہ امام مالک بادشاہ کی مدح کیا کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب حکومت کسی بات کے منوانے پر اتر آئے تو اس کی شہرت اور ہمہ گیری میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

قاضی سحنون نے اس مذہب کو افریقہ میں پھیلایا۔ چنانچہ مقریزی کا بیان ہے کہ المعز بادیس کے حاکم ہوتے ہی تمام اہلِ افریقہ مذہب مالکی کے قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس لئے کہ ہر ایک کا فائدہ بادشاہ کی خوشی سے وابستہ تھا اور حکام سب کے سب اسی مذہب کے پابند تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب اپنی ذاتی صلاحیت کی بنا پر مشہور نہیں ہو سکا بلکہ اس کی شہرت کا اہم سبب اندلس کے حکام کا جبر و تشدد اور افریقہ کی رعایا کی حرص و طمع تھی، جہاں روحانیت کا کوئی تصور نہ تھا۔

بنی تاشفین پانچویں صدی میں اندلس کے حاکم ہوئے۔ اور ان کا دوسرا بادشاہ علی بن یوسف بن تاشفین تخت پر بیٹھا تو اس نے فقہا کی بڑی عزت کی لیکن انھیں کو مقرب بنایا جو مذہب مالکی سے واقف تھے۔ اب اس مذہب کی کتابیں اس قدر مشہور اور اہم ہو گئیں کہ کتاب و سنت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔

سیاست کی ایک چال یہ بھی تھی کہ اس نے ایسی باتوں میں دخل اندازی کی جس سے اس کو الگ رہنا چاہئے تھا اس لئے کہ شاہی احکام کے بعد امت اپنے مصالح و مفاسد کو سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حنفی مذہب کی طرح مالکی مذہب بھی کافی مشہور ہو گیا۔ اور اگر کہیں پر ٹھپ ہوتا ہوا نظر آیا تو قضاؤتوں نے فوراً بروقت کمک پہنچائی۔ ایک زمانہ میں مدینہ میں یہ مذہب بجھنے لگا تو ابن فرحون کی قضاوت نے فوراً روشن کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مذاہب کے اشتہار میں اعتقاد حقیقت کو کم دخل تھا اور زمانہ کو زیادہ۔ امت کے ضعیف، صاحبانِ قوت کی تقلید کرتے تھے اور ذاتی معرفت اور شخصی اہلیت سے بے بہرہ تھے۔ سلطنت بھی اپنے کو دینی رنگ دینا چاہتی تھی۔ حکام بھی دنیا سے مغلوب ہو چکے تھے اس لئے اب جو نہ ہو جاتا کم تھا۔

ابن حزم کا بیان ہے کہ دو مذہب ابتدا میں صرف ریاست و حکومت سے پھیلے۔ مذہب حنفی ابو یوسف کی قضاوت سے اور مذہب مالک اندلس میں یحییٰ بن یحییٰ کے تقرب سے، جب کہ قاضیوں کا انتخاب بھی انھیں اربابِ مذہب کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ اور لوگ بھی دنیاداری کی خاطر اپنے کو وہی رنگ دے لیا کرتے تھے۔ (ابن خلکان ۲ ۱۲۶)

محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ جس مذہب کے اصحاب مشہور صاحبِ قضا و فتویٰ، مصنف و مدرس ہوتے تھے وہ مشہور ہو جاتا تھا اور جس مذہب کے اصحاب گمنام، گوشہ نشین، عزلت گزین ہوتے تھے وہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فنا ہو جاتا تھا۔ یہی تمام علماء و مورخین کا اتفاقی فیصلہ ہے اور اسی لئے مشہور ہے کہ لوگ بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں۔

---

# مذہبِ شافعی

ابتدا میں اس کا سلسلہ مصر سے شروع ہوا، اس کے بعد بغداد و خراسان تک پہنچ گیا۔ ۳۰۰ھ کے بعد افریقہ و اندلس تک رسائی ہوگئی۔ ایوبی دورِ حکومت میں شہرت ہمہ گیر ہوگئی اس لئے کہ اس کی حکومت نے شافعی ہونے کے رشتہ سے فقہاء کے لئے مدرسے بنوائے اور منصبِ قضاوت انھیں کو سونپ دیا۔

فاطمیین کے دور میں مصر پر شیعیت غالب تھی۔ اس کی تعلیم جامعۂ ازہر وغیرہ میں ہوتی تھی۔ صلاح الدین نے اپنے دور میں اس تعلیم کو بند کرا کے شافعی، ابوحنیفہ اور مالک کے مذہب کو زندہ کیا۔ ان کے لئے مدرسے بنوائے اور اوقاف کے ذریعہ لوگوں کو مدرسوں کی طرف کھینچ لیا۔

صلاح الدین کے بعد یہ مذہب روز بروز بڑھتا گیا۔ ابتدا میں جب یہ مصر آیا تو مذہب مالکی سے ٹکراؤ ہوا۔ مالکیوں نے کافی زور لگایا لیکن بنی [illegible] ہونے سے یہ مذہب کامیاب ہوگیا۔ عبداللہ بن حکم مالکی مذہب کے بہت بڑے عالم و رئیس تھے لیکن جب شافعی وہاں پہنچے تو ان کا کافی احترام کیا۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال بھی انھیں کے گھر میں ہوا اور اس کے اثر سے عبداللہ نے انھیں کا مذہب قبول کرلیا اور امام شافعی رشید کا سفارشی خط بھی والیٔ مصر کے نام لائے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ شافعی ۱۹۸ھ میں عبداللہ بن عباس عباسی امیرِ مصر کے ساتھ آئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کے اعیان و زعماء سب آپ کے ہم خیال ہوگئے اور آپ کے مذہب کو کافی مدد مل گئی۔

---

# مذہبِ حنبلی

یہ مذہب بغداد میں ظاہر ہوا اور باہر بہت کم نکل سکا۔ ساتویں صدی میں مصر میں چند افراد سے شروع ہوا لیکن عبداللہ بن محمد حجازی کے قاضی ہوجانے سے ۷۳۸ھ میں وہاں کافی شہرت پیدا کرلی۔

ابن خلدون کا بیان ہے کہ احمد بن حنبل کے مقلدین کی کمی کا سبب یہ ہے کہ وہ اجتہاد بہت کم کرتے تھے۔ صرف روایتوں میں جوڑ توڑ کیا کرتے تھے۔ ان کے اکثر مقلدین شام اور عراق میں پائے جاتے ہیں جو روایتِ حدیث اور حفظِ سنت میں سب سے آگے ہیں۔ قدیم علماء احمد کو فقہا کے بجائے اہلِ حدیث میں شمار کرتے تھے۔ اس لئے اختلافات میں ان کا ذکر نہ آتا تھا۔

ابن جریر کا قول تھا کہ وہ مردِ حدیث ہیں، مردِ فقہ نہیں ہیں۔ مقدسی کا بھی یہی خیال تھا۔

ابن قتیبہ نے معارف میں انھیں فقہاء سے نکال دیا ہے اور یہی کام ابن عبدالبر نے اپنی کتاب انتقاء میں کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مذہب حنبلی کے مقلد بہت کم ہیں اور یہ اپنی اسی اقلیت پر خوش ہیں۔ اس مذہب کی کچھ عظمت بغداد میں ظاہر ہوئی جب کہ باہمی اتحاد کی بنا پر ان میں اتنی طاقت پیدا ہوگئی کہ ایک حکومت کا دل لرزا دیں۔ اب ان لوگوں نے دیگر مذاہب کی مخالفت شروع کردی اور امر بالمعروف کا سہارا لے کر ہر ایک کی مذمت کا بیڑا اٹھا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ان کی شہرت کو روک دیا۔

مذہب حنبلی کو زیادہ مددگار نجد میں ملے جہاں محمد بن عبدالوہاب نے اسے اپنا کر اس کے سلسلۂ بقا کو آگے بڑھا دیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہابیت کے سامنے اس کا نام بھی نہ آسکا۔ اس مذہب

پر ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم کے احسانات نہیں بھلائے جاسکتے ہیں جن کے افکار کی نظم صورت وہابیت ہے۔ یہی وہ اسباب وعوامل تھے جن سے ان مذاہب کو عوامی شہرت ملی اور ہر جماعت نے آنکھ بند کرکے اس کی تائید شروع کردی حقیقت روپوش اور جہالت بے نقاب ہوگئی۔

بہتر تو یہی ہوتا کہ حکومت عوام کے دین وشریعت میں دخل انداز نہ ہوتی لیکن سیاست نے امت کو ایسے تعصب کا شکار بنا دیا جس کے فسادات میں بے شمار مسلمانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اختلافات بڑھے، امت میں کدورت پیدا ہوئی۔ الفت افتراق سے بدلی اور اخوت عداوت میں مبدل ہوگئی اور چار مذاہب کی پابندی کا نقصان بھی ظاہر ہوگیا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثریت نے آنکھ بند کرکے اس پابندی کو قبول کرلیا اور یہ نہ سوچا کہ شریعت کو چار آدمیوں کے اقوال میں منحصر کر دینا فکر کو معطل اور دماغ کو مفلوج بنا دینے کے برابر ہے۔ یہ تو حکومتِ وقت کی ایک چال تھی کہ اپنے اعمال کو دین کا رنگ دینے کے لئے کسی ایک شخص کو آگے کھڑا کر دے۔

لطف تو یہ ہے کہ خود یہ چاروں حضرات بھی اس پابندی کے مخالف تھے۔ چنانچہ مالک کا قول تھا کہ میں خطاکار انسان ہوں، میرے اقوال کو کتاب وسنت پر پرکھو۔

ابو حنیفہ کہتے تھے کہ اس مسئلہ میں میری ذاتی رائے یہ ہے۔ اگر کوئی اس سے بہتر رائے قائم کرلے تو میں خود بھی قبول کرنے کو تیار ہوں۔

شافعی کا اعلان تھا کہ اگر کوئی صحیح حدیث میرے قول کے خلاف مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر ماردو۔

احمد ارشاد فرماتے تھے کہ دین میں لوگوں کی پابندی انسان کے علم کی تنگی کا نتیجہ ہے۔ دین میں لوگوں پر اعتماد نہ کرو وہ بھی تو خطاکار ہوتے ہیں۔

بہرحال ان تمام اختلافات اور جھگڑوں کے باوجود خلفاء اور حکام کی نظرِ عنایت سے ہر مذہب نے ایک اہمیت پیدا کی اور حکومت نے اپنی سیاست کو شرعی بنالیا اور جیسے جیسے یہ منطق آگے بڑھتی گئی مذہب کے جسم میں جان پڑتی گئی۔ اس کے بعد ۶۴۵ھ میں ایک اور تازہ مصیبت پیش آئی اور وہ یہ کہ مدرسہ مستنصریہ کے مدرسین کو وزیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے یہ مطالبہ کیا کہ اب کتابوں کی باتیں نہ کی جائیں۔ صرف بزرگوں کا ذکر رہے۔ یہی ادب ہے اور اسی میں برکت ہے تو جمال الدین،

عبدالرحمٰن بن جوزی حنبلی اور سراج الدین مالکی دونوں نے اس کی تائید کر دی۔ شہاب الدین شافعی اور عبدالرحمٰن حنفی نے کھل کر کہہ دیا کہ بزرگ بھی آدمی تھے۔ اور ہم بھی آدمی ہیں۔ ہم تقلید نہ کریں گے۔ وزیر نے یہ خبر مستعصم تک پہنچائی اس نے پھر سب کو طلب کیا اور اب سب نے تائید کر دی۔

مقریزی کا بیان ہے کہ ظاہر بیبرس کے دورِ حکومت میں ۶۶۵ھ میں چاروں قاضی تھے۔ جس کی وجہ سے چار ہی مذہب رہ گئے۔ اس کے علاوہ کسی مذہب والے کو نہ قاضی بنایا گیا، نہ اس کی گواہی تسلیم کی گئی اور نہ اس کو خطابت و امامت و تدریس کے عہدے دیئے گئے۔ فقہاء نے بھی یہ اعلان کر دیا کہ ان چار کے علاوہ کوئی مذہب اختیار کرنا حرام ہے۔

استاد عبدالمتعال صعیدی عالم ازہر اپنی کتاب "میدانِ اجتہاد" میں لکھتے ہیں کہ جب بنی عباس نے دیکھا کہ وسائل قہر و غلبہ بیکار ہو رہے ہیں تو تعلیم کے راستہ سے داخل ہونا شروع کیا اور اس کی ذمہ داری سنبھالی تاکہ علماء کو اپنا پابند بنائیں اور شروع ہی سے انھیں خرید لیں۔ امت چونکہ تعلیم کو آج کے طریقہ سے کل بھی حکومت سے الگ سمجھتی تھی اس لئے مسجدوں میں درس ہوتے تھے اور اسی چار دیواری میں حکومتی دباؤ سے آزاد ذہن کے علماء پیدا ہوتے تھے جنھیں نہ حاکم کی خواہش کا خیال تھا نہ سرکش کے ظلم کا۔

بنی عباس نے چاہا کہ اس سیرت کو بدلیں چنانچہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے کر مسجدوں کے بجائے مدرسے بنوائے۔ علماء کے لئے اوقاف مقرر کئے اور تعلیم کو حکومت کا تابع بنا دیا۔ علماء حکومت کے ہاتھ بکنے لگے۔ دل سے مخالفت کی جرأت نکل گئی اور صحیح تبلیغ کا جذبہ مفقود ہو گیا۔ سب سے پہلے بیہقی متوفی ۴۵۰ھ کے نام پر مدرسہ بنا۔ اس کے بعد نصر بن سبکتگین نے نیشاپور میں سعیدیہ مدرسہ بنوایا۔ اس کے بعد ۴۵۹ھ بغداد میں نظام الملک نے نظامیہ مدرسہ قائم کیا جس کے افتتاح کا زبردست جشن منایا گیا۔ پھر جب صلاح الدین ایوبی مصر آیا تو اس نے مذہب شافعی کی تعلیم کے لئے ۵۶۶ھ میں مدرسہ ناصریہ قائم کیا۔ اس کے بعد ۵۷۲ھ میں مدرسہ صلاحیہ تعمیر کرایا۔ جن کے نگراں کے لئے ۴۰ ہزار دینار ماہانہ اور روز کے لئے ۶۰ رطل روٹی اور پانی کا انتظام کرایا۔ پھر دوسرے مدارس بھی قائم ہوئے۔ عباس عبیدی کے گھر حنفیوں کا مدرسہ بنا۔

صلاح الدین کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان مذاہب کو رائج کر کے مذہب شیعہ اور اس کے تعلیمات

(تمدن اسلامی ۱/۱۰۹)

مقصد یہ ہے کہ مذہب سیاست کے ساتھ چلتا رہا اور بادشاہ کے نظریات کے ساتھ لوگ مذہب تبدیل کرتے رہے۔ امیر بلبغار بن عبداللہ کے سبب سے بہت سے شافعی حنفی بن گئے۔ اس لئے کہ وہ تبدیل مذہب پر انعام بانٹا کرتا تھا۔ (شذرات الذہب ۳/۲۱۶)

ابوالبرکات حنفی نے حنبلی مذہب اختیار کرلیا تو حنفیوں نے اذیت دی اور وہ شافعی ہو گئے۔ موید تکریتی نے ان کی ہجو میں اشعار کہے جن کا مفہوم یہ تھا کہ "تم دنیا کے چکر میں شافعی بنے ہو اب تمھارے مالکی ہونے کا انتظار ہے۔ اسی طریقے سے سبط بن جوزی حنبلی تھے۔ بادشاہ نے انھیں حنفی بنالیا۔ (شذرات الذہب ۵/۲۶۷)

انھیں وسائل کی بنا پر لوگ چاروں مذاہب کی طرف کھنچ گئے اور دوسرے علماء اجتہاد کی صلاحیتوں کو پامال کرکے بزرگوں کی تقلید پر مجبور ہو گئے۔ شیخ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے استاد بلقینی سے پوچھا کہ شیخ تقی الدین بن سبکی میں اجتہاد کی کیا کمی ہے اور وہ تقلید کیوں کرتے تھے؟ تو انھوں نے سکوت اختیار کیا۔ میں نے کہا کہ میری نظر میں اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اب مدعی اجتہاد کو نہ وظیفہ ملتا ہے نہ ولایت بلکہ وہ بدعتی کہا جاتا ہے تو وہ یہ سن ہنسنے لگے اور میری تائید کی۔

یہی ذہنیت تھی جس کی بنا پر مذہب اہلبیتؑ کو مختلف حملوں اور یورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ شیعوں نے اپنے کو خطرات میں ڈالا، تہمتیں برداشت کیں، حکومت کی نظر میں کافر بنے لیکن تعلیمات پیغمبرؐ اور احکام اسلام کو اہلبیتؑ رسالت سے اخذ کرنے پر جمے رہے۔ انھیں کو قرآن کا ہمسر، نجات کا ضامن، نوح کا سفینہ اور بنی اسرائیل کا باب حطہ سمجھتے رہے۔ اس سلسلہ میں تمام زحمتیں برداشت کرکے یہ نتیجہ پیش کیا کہ آج بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ان کا مدرسہ حکومت سے الگ ایک انداز رکھتا ہے۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اجتہاد و تقلید کا بھی ایک تذکرہ کر دیا جائے لیکن اس کے پہلے ابوزرعہ کی تائید بھی ضروری ہے کہ اگر دنیا کا خطرہ نہ ہوتا تو کیا سبب تھا کہ سلسلہ اجتہاد کو روک دیا جائے جب کہ اسکا باقی رہنا امت کے لئے زیادہ مفید تھا۔ ہم پہلے علماء کے ان اقوال کو پیش کریں گے جن میں اس تقلید کی مخالفت کی گئی ہے اور اس کے بعد اس تقلید کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے حقیقت حال کو واضح کریں گے۔

# اجتہاد و تقلید کا سنگم

# اجتہاد و تقلید کا سنگم

۱۔ میں ایک انسان ہوں جس سے خطا و صواب دونوں ممکن ہیں۔ میرے اقوال کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھا کرو۔ (امام مالک)

۲۔ اگر میرے قول کے خلاف کوئی حدیث مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر مار دو۔ (شافعی)

۳۔ یہ میری بہترین فکر ہے۔ اگر کوئی اس کے خلاف رائے قائم کرے گا تو میں قبول کرلوں گا میری دلیل کو سمجھے بغیر میرے کلام سے فتویٰ دینا حرام ہے۔ (ابو حنیفہ)

۴۔ انسان کے علم کی کوتاہی یہ ہے کہ آدمیوں کی تقلید کرے۔ دین میں آدمیوں کی تقلید نہ کرو۔ اس لئے کہ وہ غیر معصوم ہیں۔ میں کلام خدا اور رسولؐ کے ساتھ اپنے کلام کو نہیں ملا سکتا اس لئے فقہ میں کوئی کتاب تالیف نہ کروں گا۔ (احمد بن حنبل)

۵۔ کسی صحابی یا امام مذہب کے قول کی بنا پر آیت یا حدایت کو نہیں چھوڑا جا سکتا ہے اور جو ایسا کرے گا وہ گمراہ اور بے دین ہوگا۔ (محی الدین ابن عربی)

۶۔ ہمیں نہیں معلوم کہ بزرگوں میں سے کسی نے ایک مذہب کی پابندی لازمی قرار دی ہو۔ اور اگر ایسا کیا بھی ہے تو غلط کیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے ان تمام حدیثوں کے معطل ہو جانے کا اندیشہ ہے جن پر اس مجتہد نے عمل نہیں کیا ہے۔ درحقیقت شریعت تمام مجتہدین کے ذخیروں کے مجموعہ کا نام ہے۔ کسی ایک مجتہد کی رائے کا نہیں اور کسی ایک کی تقلید ہو بھی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ خود ائمہ مذاہب نے اس سے برأت کی ہے اور حدیث کے مقابلے میں اپنے کلام

کو دیوار پر مار دینے کا حکم دیا ہے۔ (شعرانی)

۷۔ ابن تیمیہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اجتہاد کرنے کے بعد ایسی صحیح روایتیں تلاش کر لے جو اس کے مذہب کے خلاف لیکن قانون کے موافق ہوں تو اسے کیا کرنا چاہئے۔ مذہب کی پیروی یا حدیث کا اتباع؛ تو انھوں نے فرمایا "خدا کا شکر ہے کہ کتاب وسنّت واجماع کی رو سے صرف اللہ ورسولؐ کی اطاعت واجب ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ خود حضرت ابوبکر نے فرمایا ہے کہ جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو اور اگر میں مخالفت کروں تو تم آزاد ہو۔

اس کے علاوہ ساری امت کا اتفاق ہے کہ سوائے پیغمبر[لہ] کے کوئی دوسرا معصوم نہیں ہے۔ اسی لئے اکثر ائمہ نے یہ فرمایا ہے کہ ہر شخص کے کلام میں اچھا برا سب کچھ ہوتا ہے سوائے کلام پیغمبرؐ کے۔

خود ائمہ اربعہ نے ہر بات میں اپنی تقلید سے روکا ہے اور یہ ضروری بھی تھا جیسا کہ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے۔ ابویوسف امام مالک کے پاس پہنچے اور ان سے صاع اور سبزیوں کا صدقہ اور جنس کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے حدیث کا مفہوم بیان کیا۔ ابویوسف نے بے ساختہ کہا کہ میں نے بھی اپنی رائے بدل دی ہے بلکہ اگر استاد اس روایت کو دیکھتے تو وہ بھی اپنی رائے بدل دیتے۔ امام مالک اپنے کو ایک خطا کار بشر سمجھتے تھے۔ شافعی حدیث کے مقابلہ میں اپنے قول کو ٹھکرا دینے کے قابل تصور کرتے تھے۔

(جلاء العینین آلوسی ص۱۰۷)

۸۔ جو شخص اللہ کے فضل وکرم کو بعض لوگوں سے مخصوص اور شریعت فہمی کو چند افراد میں منحصر کر دے۔ وہ اللہ کی بارگاہ میں بے ادب اور شریعت کی نظر میں گستاخ ہے اس لئے کہ شریعت صرف چند آدمیوں کے گھر نہیں اتری ہے بلکہ وہ ہر دور کے لئے ہے۔ اگر ہمارا کام صرف تقلید ہوتا اور ہم کتاب و سنت کے سمجھنے سے قاصر ہوتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ شریعت ہمارے لئے منسوخ ہو جائے۔

---

لہ یہ ابن تیمیہ کی ذاتی رائے ہے۔ ورنہ مذہب شیعہ کی نظر میں پیغمبرؐ کی طرح ائمۂ کرام بھی معصوم ہوتے ہیں جیسا کہ آیت تطہیر، حدیث ثقلین، آیت مودت، آیت اطاعت وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے۔ (مترجم)

خدایا یہ کتنا بڑا بہتان ہے۔ (حسن خاں)

۹۔ کسی انسان کے لئے ایک مذہب کی پابندی ضروری نہیں ہے اور نہ اسے یہ اختیار ہے کہ ایک مذہب میں رہ کے دوسرے امام کے فتوے پر عمل کرے۔ اس لئے کہ اس طرح پہلے امام کا فتویٰ باطل ہو جاتا ہے درآنحالیکہ قاضی کا حکم ٹوٹتا نہیں ہے۔ (جلاء العینین)

۱۰۔ یاد رکھو کہ مقلد کو اپنے عمل پر اطمینان نہیں ہو سکتا ہے۔ تقلید عقل کو معطل کر دیتی ہے عقل فکر و نظر کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ کتنی بری بات ہے کہ آدمی اپنی شمع کو گل کر دے اور دوسرے کے اندھیرے میں راستہ طے کرے۔ یاد رکھو کہ عام طور سے مذہب والے شخصیت پرست ہوتے ہیں۔ بات کو سوچنے کے قائل نہیں ہوتے ہیں اور یہی واقعی گمراہی ہے۔ انسان کی نظر قول پر ہونی چاہئے نہ کہ قائل پر۔ (کتاب تلبیس ابلیس، ابن جوزی ص۸۱)

۱۱۔ یاد رکھو خدا نے کسی بندے کو نہ حنفی بننے کا حکم دیا ہے نہ مالکی بننے کا۔ شافعی ہونے کو واجب کیا ہے نہ حنبلی ہونے کو، اس نے تو رسول اکرمؐ کی شریعت پر عمل واجب کیا ہے۔

(القول السدید ص۳۰ عبدالعظیم مکی)

۱۲۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ مقلد قسم کے فقہاء، اپنے امام کے قول کی کمزوری کو دیکھ کر بھی اسی کی تقلید کرتے ہیں اور کتاب وسنت وعقل کو ترک کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تقلید کی خاطر ان سب میں عجیب وغریب قسم کی تاویل کر لیتے ہیں۔ سابق زمانہ میں لوگ ہر عالم سے مسئلہ پوچھ لیا کرتے تھے۔ اب ہر شخص ایک امام کا مرید بنا ہوا ہے اور اسی کو نبی مرسل سمجھتا ہے۔ یہی وہ ناانصافی اور بے تکا پن ہے جسے کوئی عاقل قبول نہیں کر سکتا ہے۔

(عزالدین عبدالسلام، رسالہ انصاف)

۱۳۔ فقہ حاصل کرنے والے کو چاہئے کہ کسی امام کا پابند نہ بنے بلکہ ہر مسئلہ میں کتاب وسنت پر نظر ڈالے، تعصب واختلاف سے کنارہ کش رہے۔ ان باتوں سے وقت برباد ہوتا ہے۔ خود امام شافعی نے بھی اپنی تقلید سے روک کر دوسرے کی تقلید کا حکم دیا تھا۔ شیخ ابو شامہ

(دائرۃ المعارف وجدی ۲ ص۲۴۳)

۱۴۔ باب اجتہاد کا مقفل کر دینا فکر کی آزادی پر ضرب کاری بلکہ اصل اسلام پر زبردست حملہ ہے۔ وہ

مختلف ادوار اور مختلف قبائل کے لئے آیا تھا لیکن مسلمانوں نے اسے جامد فرض کرلیا ہے۔

(رسالۃ المسلم محمد علی مؤلف کتاب الدین الاسلامی)

۱۵۔ اب میں یہ فیصلہ کرسکتا ہوں کہ اجتہاد کا بند کرنا قہر و غلبہ اور طمع و حرص کے ذریعہ انجام پایا۔ اگر یہی وسائل کسی دوسرے مذہب کو میسر ہوجاتے تو وہ بھی باقی رہ جاتا۔ اور یہی مسلمان اس کے بھی ماننے والے ہوجاتے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ سیاسی چالوں سے عائد کئے ہوئے مذاہب کی پابندی کو ترک کردیں اور اپنے دین میں خود اجتہاد کریں۔ اسلام مسلمانوں کے درمیان باہمی تعاون اور مشورہ چاہتا ہے۔ وہ قہر و غلبہ کا قائل نہیں ہے۔ (میدان اجتہاد ص۱۷ عبدالمتعال صعیدی)

۱۶۔ بعض مقلدین یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا امام ہی پوری شریعت ہے۔ اسی لئے ساری فضیلتوں کو اس میں سمیٹ دینا چاہتے ہیں اور اگر کسی نے دعویٰ اجتہاد کیا تو اس پر طعن و طنز، نقد و تبصرہ شروع کردیتے ہیں اور اسے جماعت سے خارج اور راستے سے منحرف سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف عوامی خیال ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں قائم ہوسکتی ہے۔ بقیع بن مخلد جس وقت اندلس آئے تو انھوں نے اس کا مکمل تجربہ کیا۔ امام مالک کے مقلدین نے انھیں ٹھاٹ باہر کردیا اور انھیں یہ کہنا پڑا کہ محبت کا غلو اور انسان کی انسان پر حکومت کا مکمل نقشہ ہے۔ (الاعتصام ۲ ص۲۵۹ شاطبی)

۱۷۔ کس روایت نے باب اجتہاد کو بند کیا تھا؟ کس مجتہد نے اپنے بعد اجتہاد کو حرام کیا تھا؟ کس نے قرآن و حدیث سمجھنے کی ممانعت کی تھی؟ کون تھا جس نے ترقی یافتہ علوم کے سہارے قرآن و سنت سے زمانہ کے ضروریات سے استفادہ کرنے کو روکا تھا؟ اللہ نے تو پیغمبر کو عربی میں قرآن اسی لئے دیا تھا کہ سب اسے سمجھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر آج ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد زندہ ہوتے تو ہر حکم کو قرآن و حدیث ہی سے نکالتے اور ہر غوطہ زنی میں نئی فکر پیدا کرتے۔ یقیناً ان بزرگوں نے بڑی زحمتیں کی ہیں۔ خدا انھیں جزائے خیر دے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کے سارے اسرار سمجھ کے اپنی کتاب میں لکھ گئے ہیں۔ (خاطرات جمال الدین افغانی ص۱۷۱)

۱۸۔ اجتہاد کا روک دینا ہی وہ سبب تھا جس نے مسلمانوں کو پیچھے ڈال دیا۔ اب گزشتہ لوگوں کے اقوال ہی سند بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس کام میں صرف سیاست کا ہاتھ تھا۔ سلاطین نے اجتہاد کو روکا

تھا تاکہ اپنے ملک کو بچائیں۔ اپنے معارض ومقابل کو دبائیں اور جب کوئی مصلح یا ذمہ دار پیدا ہو تو اس کی بات نہ سنی جاسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فقہ جس سے جماعت کی روح اور امت کی زندگی وابستہ تھی منجمد ہو کر رہ گئی۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دور حضرت عثمان میں فتوحات کا رک جانا، خانہ جنگی کا شروع ہوجانا، فتنوں کا ترقی کر جانا، ان سب کا راز صرف یہ تھا کہ انھوں نے اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر شیخین کی تقلید کی پابندی قبول کرلی تھی۔ حضرت علیؑ نے اسی لئے اس کی موافقت نہیں کی کہ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس بات نے عثمان کو تخت پر بٹھایا تھا اسی نے اتار بھی لیا۔ (الفلسفۃ السیاسیہ للاسلام ص۱۲۱ ڈاکٹر عبدالدائم نقری انصاری)

۱۹۔ تاریخ کے دفتر میں کتنے ہی سیاسی حزب ایسے ہیں جو دینی مذہب بن گئے۔ کتنے غافل ایسے ہیں جو فروعی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے۔ یہ کسی نے نہ سوچا کہ ہم دونوں ہی مسلمان ہیں اور عداوت نہایت ہی خطرناک چیز ہے۔ اجتہاد سہولت کا ایک ذریعہ تھا اور سہولت اسلام کا اہم مقصد تھا۔ اجتہاد سے امواجِ فکر میں تلاطم پیدا ہوتا ہے اور تلاطم سے جوہر حقیقت ساحل تک آجاتا ہے۔ حوادث لامتناہی ہیں لہٰذا ان کا حل بھی غیر محدود ہونا چاہئے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ باب اجتہاد کا بند کر دینا یہ خود بھی ایک اجتہاد ہے۔ اب ان لوگوں سے کون پوچھے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ (النواۃ فی حقل الحیاۃ ص۱۳۶، علامہ عبیدی)

یہ بعض شواہد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ باب اجتہاد کا بند کر دینا کوئی شرعی کام نہ تھا بلکہ اس کے اغراض تمام تر سیاسی تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شیعوں نے اس ناروا سیاست سے کنارہ کشی کرکے اہلبیتؑ کے طریقہ کو اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں بہت سے رسالے بھی تالیف کئے گئے ہیں۔ ان میں اجتہاد کی بندش پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکام وقت کی اس مصلحت پرستی کا کیا حل نکالا جائے۔ غزالی اور العزبن عبدالسلام وغیرہ نے نہایت بیباکی کے ساتھ یہ اعلان کردیا کہ اس بندش کا سبب صرف شہرت، حکومت پرستی اور منصب قضاوۃ وتولیت وغیرہ تھا۔ انسان کی تربیت ہی اس انداز سے کی گئی تھی کہ وہ ذہنی طور پر کسی ایک مذہب کا پابند ہوجائے اور اس کے علاوہ کچھ نہ سوچ سکے۔ علاوہ ان بلند نفس افراد کے جو حق وحقانیت کی جستجو میں سرگرداں رہا کرتے تھے اور عادت وعقیدت کے پابند نہیں تھے۔ (الوحدۃ الاسلامیہ محمد رشید رضا ص۱۱۲) تقلید کی پابندی کرنے والے

افراد زیادہ تر وہ تھے جو مرتبۂ اجتہاد تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے یا حکومت کی نظرِ عنایت کے طفیل میں ایک محدود درجہ میں سمٹ کر رہ گئے تھے اس لئے وہ کسی کو اس مرتبہ پر دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کی نظر میں ہر مدعیٔ اجتہاد دیوانہ، گمراہ اور بدعتی ہوتا تھا۔ جیسا کہ شیخ داؤد نقشبندی نے اپنی کتاب "اشد الجہاد" میں فتویٰ دیا تھا یا شیخ احمد بن عبد الرحیم نے مجتہدین کی تقسیم کرتے ہوئے تیسرے طبقہ کے مجتہدین میں ان مسلمانوں کو شمار کیا تھا، جو چوتھی صدی سے پیدا ہوئے ہیں۔

اس دور کے افراد کا فرض یہ ہے کہ کسی پابند مذاہب مجتہد کی تقلید کریں۔ اب مستقل مجتہد کا وجود محال ہے۔ اس لئے کہ امت کا یہ اجماع ہے کہ شریعت کو سمجھنے میں بزرگوں پر اعتماد کرنا چاہئے۔ اور ان پر اعتماد کے معنی یہ ہیں کہ ان کی روایتیں اور ان کی کتابیں دیکھی جائیں۔ ان کے عام، خاص، مطلق، مقید، راجح، مرجوح کو ملاحظہ کیا جائے جو بات صرف چاروں مذاہب میں پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ امامیہ اور زیدیہ میں بھی یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ اہلِ بدعت ہیں۔ ان کا اتباع نہیں ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس صرف چار ہی مذہب رہ گئے ہیں۔ (رسالہ انصاف دہلوی)

بعض لوگوں نے زورِ استدلال میں چاروں ائمۂ مذاہب کو معصوم تک بنا دیا ہے۔ صرف اس بنیاد پر کہ یہ نبی معصوم کے وارث ہیں لہٰذا خود بھی معصوم ہوں گے اور جب معصوم ہوں گے تو انھیں کا اتباع واجب ہوگا۔

ہمیں ان افراد سے کوئی بحث نہیں ہے جو چاروں اماموں کے بعد سب کو نالائق سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے تمام دلائل کی بنیاد ہی پوری امت کے نااہل، مدعی اجتہاد کے گمراہ اور فسادی ہونے پر ہے۔ وہ ایسے آدمی پر حد بھی جاری کر دیتے ہیں، جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطی کا حشر ہوا کہ انھیں صرف دعوائے اجتہاد پر کافی سخت وسست سننا پڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ آخری صدیوں میں ایسے افراد یقیناً پیدا ہوئے ہیں جو اجتہاد کے اہل تھے اور جنھوں نے اپنی تالیفات سے یہ ثابت کر دیا کہ چاروں امام مل کر بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ مثلاً احمد بن محمد اسفرائنی جنھیں شافعی سے بہتر کہا گیا ہے۔

یا شیخ عبد العزیز بن سلام متوفی ۵۷۰ھ، شیخ عبد الکریم قزوینی متوفی ۶۲۳ھ، اسمٰعیل بن عبد الرحمٰن صابونی متوفی ۴۴۹ھ، محمد بن اسحٰق تونی متوفی ۶۷۳ھ، ابراہیم بن محمد اسفرائنی متوفی ۴۱۸ھ وغیرہ

جن کے اجتہاد میں شک نہیں ہو سکتا ہے۔ زیادہ دور کیوں جائیے یہی قفال، جوینی، صیدلانی، سنجی، سرخسی، جصاص وغیرہ کو لے لیجئے کہ جن میں اجتہاد کی صلاحیتیں تھیں لیکن عوام کی طرف سے زبان بندی دیکھ کر دعویٰ نہ کر سکے۔ انھیں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں دعویٰ اجتہاد پر شیعیت کا الزام نہ لگ جائے۔

(اشد الجہاد ص۲۵)

ابوالحسن دارکی جو اپنے وقت کے عظیم مجتہد تھے۔ جب ان سے کوئی بات پوچھی جاتی تھی تو بہت سوچ کر جواب دیتے تھے اور اگر ان کا فتویٰ شافعی یا ابوحنیفہ کے خلاف ہوگیا تو لوگ سخت مخالفت کرتے تھے اور وہ اس پر جل کر یہ جواب دیتے تھے کہ میں رسولؐ کی حدیث بیان کرتا ہوں اور تم شافعی کا مذہب۔ یہی حشر تقی بن مخلد، ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کا ہوا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ چار اماموں کے بعد باقی آدمیوں کے مقدر میں قصور، نقص اور تقلید کیوں لکھ دی گئی ہے، سارا کمال ان چار ہی میں کیوں منحصر ہوگیا۔

---

# اجتہاد

لغوی اعتبار سے کسی دشوار کام میں کوشش کرنے کا نام ہے۔

ابن ابی زرعہ نے ماوردی سے نقل کیا ہے کہ اجتہاد جہادِ نفس سے نکلا ہے۔

اصطلاحی اعتبار سے اجتہاد کسی فقیہ کی اس انتہائی کوشش کا نام ہے جس سے حکمِ شرعی کا ظن حاصل کیا جائے اور فقیہ سے مراد وہ بالغ وعاقل ہے جو استنباط کا ملکہ رکھتا ہو۔ (جمع الجوامع)

ابو اسحق کا کہنا ہے کہ بیوقوف آدمی کو مجتہد نہیں کہہ سکتے ہیں۔ منکر قیاس کے اجتہاد کے بارے میں اختلاف ہے۔ البتہ مجتہد کو قانون برأت، علم لغت، نحو وصرف، اصول فقہ، منطق، بلاغت، کتاب و سنت وغیرہ سے واقف ہونا چاہئے تاکہ صحیح استنباط کر سکے۔ یہ اور بات ہے کہ ان تمام باتوں کا زبانی یاد ہونا ضروری نہیں ہے۔

علامہ سبکی کی نظر میں مجتہد اس شخص کو کہتے ہیں جو اکثر قواعد شرع کی مزاولت کر کے فکر وفہم کا مادہ پیدا کر لے، اسے اجتماعی مسائل، ناسخ ومنسوخ، اسباب نزول، متواتر وآحاد، صحیح وضعیف، سیرت صحابہ وغیرہ سے واقف ہونا چاہئے۔ علمِ کلام، فقہی تفصیلات کا علم، ذکوریت، حریت اور عدالت شرطِ اجتہاد نہیں ہیں۔

ان شرائط کو دیکھنے کے بعد کیا کوئی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ ان صفات کا جامع انسان چار اماموں کے بعد نہیں پیدا ہوا ہے جب کہ ہمارے پیشِ نظر ان تمام علوم کے بڑے بڑے اساتذہ بھی ہیں۔

---

# تقلید

کسی شخص کے قول کو بغیر دلیل کے مان لینا۔

ابن ابی زرعہ شرح جوامع میں لکھتے ہیں کہ فاضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی تقلید میں علماء کے چند قول ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ یہ بات جائز ہے جیسا کہ صحابہ کے دور میں یہ رواج تھا کہ ہر ایک سے مسئلہ پوچھا جاتا تھا۔ امام احمد اور ابن سریج اور قاضی حسین وغیرہ نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کسی کو فاضل یا مساوی سمجھتا ہے تو اس سے استفسار کر سکتا ہے ورنہ حرام ہے۔

اسی انداز سے تقلید میت کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور کی نظر میں یہ جائز ہے جیسا کہ شافعی نے کہا تھا کہ صاحب مذہب کے مرنے سے مذہب نہیں مرتا ہے۔

امام غزالی اور امام رازی اسے مطلقاً حرام سمجھتے تھے۔ بعض لوگ زندہ مجتہد کی موجودگی میں حرام سمجھتے تھے ورنہ جائز تھا۔

شیخ محی الدین فتوحات مکیہ باب ۳۱۸ میں لکھتے ہیں کہ دین خدا میں زندہ مردہ کسی کی تقلید جائز نہیں ہے۔

ابن عابدین شامی کی نظر میں افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی تقلید جائز ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی اور اکثر حنبلیوں کا بھی یہی قول ہے۔

امام احمد وغیرہ نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔

---

# معاصرانہ چشمک

شروع شروع میں مسلمانوں کے باہمی اختلاف کا رنگ صرف مذہبی تھا کہ ہر ایک دوسرے کے قول پر اعتراض اور دوسرے کی رائے پر اشکال کیا کرتا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان اختلافات نے سیاسی طاقت پاکر اپنے دائرہ کو بہت زیادہ وسیع بنالیا اور امت ایک عظیم افتراق کا شکار ہوگئی۔ حکامِ وقت نے ان اختلافات کو باقاعدہ ہوا دی اس لئے کہ سیاست کا مقصد علمار کے اتحاد سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ (فلسفۃ السیاسیہ للاسلام)

ائمۂ مذاہب کے بعد ان کے چاہنے والوں کا دور آیا۔ انھوں نے اپنے مذہب سے عقیدت وارادت کی بنیاد پر ان اختلافات کو اور بھی بڑھا دیا۔ جماعتیں قائم ہوئیں۔ ہر امام کا مذہب مقرر ہوا۔ اور مسلمان کسی نہ کسی مذہب کے اپنانے پر مجبور ہو گئے۔ ان حضرات نے یہ نہ سوچا کہ اس قسم کی سیاسی پارٹی بندی سے علم کا جوہر ضائع ہو رہا ہے اور حقیقت پامال سمِ اسپانِ سیاست ہوئی جارہی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رسالہ انصاف ص۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی اور دوسری صدی میں مسلمان کسی ایک مذہب کی پابندی پر مجبور نہ تھے بلکہ غیر اجماعی مسائل میں اپنے ائمہ مذاہب یا اپنے شہر کے علمار کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور انھیں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نماز، روزہ، وضو، غسل جیسے تمام اعمال انجام دیتے تھے۔ ان کے ذہن میں کسی ایک عالم کی پابندی کا تصور کبھی نہ تھا۔

علمار کے دو درجے تھے :-

بعض وہ تھے جن میں خود روایات وسیرت صحابہ کو دیکھنے کی وجہ سے اتنی صلاحیت پیدا

ہوگئی تھی کہ وہ لوگوں میں فتویٰ دے سکیں اور اکثر مسائل میں انھیں خاموشی کا راستہ نہ اختیار کرنا پڑے اور بعض مثل دیگر حضرات کے تھے۔ لیکن یہ دو صدیاں کیا گذریں کہ امت داہنے بائیں منحرف ہونے لگی۔ اختلافات ونزاعات کے سیلاب نے ہر ایک کے دماغ کی رو بدل دی جیسا کہ امام غزالی نے بیان کیا ہے۔

عہد خلفاء راشدین کے بعد خلافت ایسے نااہلوں کے ہاتھ لگ گئی جو نہ حکومت کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ ان میں فتویٰ دینے کی قابلیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے علماء سے مدد لینا شروع کی اور ہر وقت ان کو ساتھ رکھنے کی کوشاں رہی۔

درجۂ اوّل کے علماء نے اس بات کو اپنے لئے باعث ننگ وعار سمجھا اس لئے حکومتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور دوسرے درجہ کے ملاؤں کو موقع مل گیا۔ انھوں نے حکومت کی توجہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے تحصیل علم کا کام شروع کردیا۔ اب تک حکومت انھیں ڈھونڈتی تھی اور اب یہ حکومت کے پیچھے دوڑنے لگے۔ اب تک عزت واقبال ان کی چوکھٹ کو بوسہ دیتے تھے۔ اب یہ سلاطین کے عتبہ بوس ہوگئے۔ صرف چند افراد رہ گئے جن کو اپنے علم میں اخلاص تھا ورنہ اکثریت تو علم کلام میں تصنیف وتالیف کے بجائے حکومتوں کی خواہش کے مطابق آپس کے حنفی اور شافعی اختلافات پر قلم دوڑانے لگی۔ مالک، سفیان اور ابن حنبل وغیرہ نظر انداز کر دیئے گئے۔ ان ملاؤں کا خیال یہ تھا کہ یہ کوئی مخلصانہ کام انجام دے رہے ہیں اور شریعت کے حقائق وجواہر کو آشکارا کرنا چاہتے ہیں اور اسی بنیاد پر یہ سلسلہ جاری رہ گیا۔

علامہ احمد بن محمد بن الخطاب الخطابی نے تیسری صدی کے بعد پیدا ہونے والے اختلاف کا نقشہ اس انداز سے کھینچا ہے۔ "آج کل علماء کی دو پارٹیاں ہوگئی ہیں، اہل حدیث اور اہل اجتہاد"۔

اہل حدیث چھوٹی بچی شاذ ونادر روایتوں کے تلاش کرنے ہی کو بہت بڑا کام سمجھتے ہیں۔ انھیں روایت فہمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اہل نظر کو حدیث وروایت کا مخالف قرار دے کر انھیں مطعون بھی کرتے ہیں۔

اہل فکر واجتہاد حدیثوں پر بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ انھیں صحیح وضعیف سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ان کے یہاں حدیث اپنی رائے کے مطابق ہے تو ضعیف بھی صحیح ہے ورنہ صحیح بھی ضعیف ہے۔ آپس میں یہ حال ہے کہ امام مالک کی روایت اگر ابن القاسم یا اشہب بیان کرے تو ٹھیک ہے ورنہ بیکار۔

امام ابوحنیفہ کا قول ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی نقل کریں تو معتبر ہے ورنہ غیر معتبر۔ شافعی کے اصحاب تک مزنی اور ربیع بن سلیمان سے حدیث پہنچے تو مناسب ہے ورنہ نامناسب۔ تعجب ہے کہ اپنے فروعی مسائل میں تو اس قدر احتیاط و تفتیش ہے کہ ایک سے نقل ہونے والا قول معتبر ہو اور دوسرے کے ذریعہ پہنچنے والا قول بیکار ہو جائے اور سرکار دو عالمؐ کے ارشادات کے بارے میں اس قدر تساہلی کہ العیاذ باللہ۔ حالاں کہ یہاں تحقیق و تفتیش کا کام کہیں زیادہ اہم تھا۔ افسوس کہ ان لوگوں نے حق کے راستے کو دشوار سمجھا تحقیق کے بارے میں سستی سے کام لیا۔ علم کے جادے کو انتہائی مختصر بنا دیا۔ اصول فقہ کے چند کلمات سیکھ کر علل و اسباب کے نام پر اپنا پرچار کرنے لگے۔ اعتراض کرنے والے مناظرہ و مکالمہ کا شکار ہو گئے۔ ظاہری علمی داؤں پیچ سے کامیاب ہو جانے والے صاحب فکر و نظر اور اہلِ علم و فقہ کے مقدس القاب سے یاد کئے جانے لگے۔ رسالۂ انصاف ص۱۷

ان علماء اعلام کے ارشادات اس بات کو واضح کر رہے ہیں کہ باہمی اختلافات نے بڑی مکروہ صورت اختیار کر لی تھی اور آپس کی نوک جھونک بڑے خطرناک موڑ تک پہنچ گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خونی انقلابات اٹھے اور انھوں نے ہزاروں جانوں کا نقصان کیا اور دوسری طرف علمی طوفان بڑھے اور انھوں نے دامنِ ایمان کی دھجیاں اڑا دیں۔

قاضی دمشق محمد بن موسیٰ الحنفی المتوفی ۵۰۶ھ نے شافعیوں کو جزیہ لینے کے قابل ٹھہرایا اور ابو حامد طوسی المتوفی ۵۶۷ھ نے حنبلیوں کو کافر کتابی قرار دیدیا۔

ان سارے اختلافات کا منشاء صرف یہ تھا کہ ان علماء نے حکومت کے بل بوتے پر ترقی شروع کی تھی اور حکومت نے ان کے سروں پر دستِ شفقت رکھ دیا تھا۔ علم و دولت کی آمیزش سے شریعت سیاست کا منھ دیکھنے لگی تھی۔

حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر علم سیاست سے الگ رہتا تو سیاست اس کی ڈیوڑھی پر جبہ سائی کرتی اور امت خیر و برکت کی راہوں پر گامزن رہتی۔ اہلِ علم کی حکام پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اسلام کو بے دست و پا سمجھنے لگے۔ اس کی ساری آبرو حکومت کی مٹھی میں آگئی۔ ورنہ کہاں اللہ کا دین اور کہاں یہ خواہشات و اختلافات؟ کہاں مذہبِ اتحاد و اتفاق اور کہاں یہ مشکلات و نزاعات؟ یہی وہ دشواری تھی جو اس وقت تک حل نہیں ہو سکتی تھی جب تک زمامِ حکومت کو سلطنتی علماء سے چھین نہ لیا جائے اور عوام کو ان کی جکڑ بند

سے آزاد نہ کرا دیا جائے۔

جب ہم مذاہب اربعہ کے پرستاروں کے درمیان ان اختلافات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایک طرف مسلمانوں کی زوال پذیر حالت نظر آتی ہے اور دوسری طرف صاحب "تبصیر" جیسے علماء کا قول کھل جاتا ہے جو ان مقلدوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کا اشتہار کر کے ان کی حقانیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لے

کاش کوئی ان علماء کو انگلی رکھ کر وہ اختلافات دکھاتا جہاں حنفی علماء منبروں سے حنبلیوں اور شافعیوں پر لعنت کر رہے تھے اور شافعی مرو میں ان کی مسجدیں ڈھا رہے تھے۔ نیشاپور میں مذہبی اختلاف جنگ و جدل کا نقشہ پیش کر رہا تھا اور شافعیوں کے خون سے زمین رنگین ہو رہی تھی اور جذبۂ انتقام میں اسراف و تعدی سے کام لیا جا رہا تھا۔ (ملاحظہ ہو حوادث ۵۵۴ھ)

یا وہ وقت جب ۶۱۶ھ میں شافعیوں اور حنبلیوں کے جھگڑے کو چکانے کے لئے حکومت دخل اندازی کر رہی تھی (البدایۃ والنہایۃ ۱۳/۷۹) جانیں تلف ہو رہی تھیں۔ اصفہان کے مکانات اور بازار نذر آتش ہو رہے تھے اور تعصب اپنا آخری مظاہرہ کر رہا تھا۔ (مراۃ الجنان ۳ / ۳۴۳)

یا جب بغداد کے مذہبی فتنوں سے عاجز آ کر حکومت مذہبی اختلافات پر قدغن لگا رہی تھی۔ (المنتظم ۱۰ / ۱۱۱)

حنبلیوں کے قائد اکبر شیخ بربہاری ۳۲۳ھ میں شافعیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مسجدوں میں پٹوا رہے تھے۔ (ابن اثیر ۸ / ۲۲۹)

واعظ قشیری کو مدرسہ نظامیہ کی تولیت پر بدنام کیا جا رہا تھا اور اس کے نتیجہ میں زمین خون سے لال ہو رہی تھی۔ (مراۃ الجنان ۳ / ۹۷)

محب الدین الحنفی الہندی المتوفی ۶۸۹ھ اپنے تعصب کو تدین قرار دے کر شافعیوں کو اذیت دے رہے تھے۔ (شذرات الذہب ۶ / ۲۴۰)

تمام مذاہب ابن تیمیہ کے حرکات کو دیکھ کر مذہب حنبلی سے برائت کر رہے تھے۔ اور یہ اعلان عام ہو رہا تھا کہ جو ابن تیمیہ کے دین پر ہو اس کا جان و مال سب حلال ہے۔

شیخ ابو حامد حنبلی ارشاد فرما رہے تھے کہ غیر حنبلی کافر ہوتا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ۳ / ۲۷۵)

شیخ ابوبکر المقری الواعظ بغداد کی مسجدوں میں جملہ حنبلیوں کے کفر کا فتویٰ دے رہے تھے۔

(شذرات الذہب ۳ ۲۵۳)

شیخ عبدالغنی المقدسی المتوفی ۶۰۰ھ دمشق میں فتویٰ کفر کا شکار بن رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔

کفر سازی کی مشین اس دور میں اس قدر سستی بک رہی تھی کہ ہر غریب سے غریب عالم کے گھر بھی اس کا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ایک طرف ابوسہیل بن زیاد قطان معتزلیوں کو باقاعدہ قرآن سے کافر ثابت کر رہے تھے اور دوسری طرف شیخ ابو اسحٰق فیروزآبادی المتوفی ۴۷۹ھ کو حنبلیوں کی مخالفت کے باعث کافی قتل و غارت کے بعد گرفتار کیا جا رہا تھا۔ (طبقات الشافعیہ ۳ ۱۰۹)

ابومنصور متوفی ۵۶۷ھ کو حنبلی حضرات زہر دے رہے تھے اور بقول ابن جوزی ایک عورت کے حلوہ کو کھانے کے باعث خود مع اہلیہ و اولاد موت سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ (طبقات الشافعیہ ۴ ۱۸۴)

ابوالحسن بن فورک کو بھی زہر دیا گیا۔

مستنصر کے خادم ابوعلی کو شافعیوں کا جاسوس قرار دے کر سات سال کے لئے قید کیا گیا۔

محمد بن عبداللہ انصاری حنبلی کو جانماز کے نیچے بت رکھ کر بادشاہ کے پاس یہ شکایت کی گئی کہ یہ بت کو اللہ کا مجسمہ سمجھ کر بت پرستی کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کو سزا ملی۔ (تذکرۃ الحفاظ ۳ ۳۵۸)

شیخ آمدی کو حنبلی مذہب کو چھوڑ کر شافعی ہو جانے پر اتنا بدنام کیا گیا کہ فاسد العقیدہ ہونے کی بنا پر بہت سے علماء نے ان کے قتل کے محضر پر دستخط کر دیئے۔ (وفیات الاعیان ۱ ۳۰۱)

حارث بن مسکین مالکی نے مصر میں حنفیوں اور شافعیوں کو مسجد سے دھکا دے کر نکال دینے کا فتویٰ دے دیا۔

۵۳۸ھ میں حسن بن ابی بکر نیشاپوری بغداد آئے اور انھوں نے اشعریوں پر ایسے حملے کئے کہ آخرکار ابواسحٰق اسفرائنی کو شہر سے نکال دیا گیا۔ (المنتظم ۱۰ ۱۰۶-۱۰۸)

تعصب کی سب سے بدتر شکل یہ تھی کہ سلطان محمود بن ناصر نے حنفی مذہب چھوڑ کر شافعی مذہب اختیار کیا اور فریقین کے علماء کے سامنے قفال مروزی سے دونوں مذہبوں کی نماز ادا کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے شافعی مذہب کی نماز باقاعدہ ادا کی اور حنفی مذہب کی وہ نماز پڑھی جس کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (وفیات الاعیان ۲ ۸۶، طبقات شافعیہ ۴ ۱۴)

شیخ علی بن الحسن سیف الدین متوفی ۶۳۱ھ حنبلی سے شافعی ہو گئے تو تمام علماء نے

ان کے کفر کا فتویٰ دے دیا۔ (مرآۃ الجنان ہ ۲۴۲)

غرض ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے جو تعصب کی تلوار سے مارے گئے اور جنھیں مذہبی اختلاف کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ بعض علماء سے شافعیوں کے خلاف جھوٹی گواہی کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ جب وہ کافر ہیں تو گواہی دے کر ان کا فاسق وجود ختم کر دیا جائے۔

علماء سوء کی یہی وہ حرکتیں تھیں جن سے اسلامی اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ مذہب جاہ وحشم کا تابع بن گیا۔ دیانت کو حکومت کی قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا اور دردمند مسلمان اور مخلص مومنوں کے دل مجروح ہو گئے۔

استاد محمد رشید رضا "صاحب المنار" لکھتے ہیں کہ "عجیب و غریب بات یہ ہے کہ شافعیوں کے باہمی اختلافات ہی نے تاتاریوں کو حملہ کرنے کا موقع دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی طاقت ایسی کمزور پڑ گئی کہ آج تک اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ آج بھی مسلمانوں کے ممالک کا جائزہ لیجئے تو بظاہر سب ایک دکھائی دیں گے لیکن واقعی طور پر ایک دوسرے کے دلی دشمن ہیں جیسا کہ قرآن کریم نے بے ایمانوں کی تعریف میں کہا تھا۔ (الوحدۃ الاسلامیہ ص۲)

تفرقہ و اختلاف کے یہ اسباب روز بروز ترقی کرتے گئے۔ امت کا ہر فرد تعصب کا شکار ہونے لگا۔ جسے جس سے ہمدردی ہو گئی اس نے اس کے لئے فضائل و محامد کے پل باندھ دیئے اور جسے کسی سے ذرہ برابر اختلاف ہوگیا اس نے اس کی مٹی پلید کر دی۔ ایک ادنیٰ سے کرشمہ سے عادل حضرات فاسق ہو گئے اور ایک معمولی نظر عنایت سے فساق کو مسند عدالت مل گئی۔ مورخ تو حالات کا منتظر رہتا ہی ہے۔ اس نے بھی تعصب، جہالت یا دوسروں کے بیان کا سہارا لے کر وہی تعمیر بلند کرنا شروع کر دی اور اس طرح اقدار و مراتب کے معیار بدل ڈالے۔

علامہ سبکی کا بیان ہے کہ "مورخین کے یہاں ارباب رجال سے بھی زیادہ تعصب و جہل ہوتا ہے۔ آپ کو کوئی تاریخ ایسی نہ ملے گی جو ان فاسد عناصر سے محفوظ رہ سکی ہو۔ بالخصوص ذہبی کی تاریخ جو اپنی جامعیت اور شہرت کے باوجود ائمہ شافعیہ و حنفیہ کی شان میں ایسے ناروا حملوں سے پُر ہے جن کا ان بزرگانِ خلق کے بارے میں تصور بھی نہ ہو سکتا تھا۔"

حافظ صلاح الدین فرماتے ہیں کہ "شمس الدین ذہبی پر مذہبی تعصب اس قدر غالب آگیا تھا کہ اس نے ان کی فکر و نظر کے راستے ہی بدل ڈالے تھے۔" (طبقات الشافعیہ ۱/۱۹۰)

مختصر یہ کہ جذبات و خواہشات نے ذہن و دماغ کے دھارے کو ایک خاص رخ کی طرف موڑ دیا۔ حقیقت قلبی تمناؤں کی راہ پر چلنے لگی۔ مذہبی تعصب اور ائمہ مذاہب کی شان میں غلو و مبالغہ نے بیان کو میزان سے جدا کر دیا۔ ہر شخص اپنے امام کی مدح میں روایات کا سلسلہ قائم کرنے لگا اور جب اپنے بیانات ناکافی دکھائی دیئے تو نبی کریمؐ کی زبان سے روایتیں وضع ہونے لگیں۔

ایک نے رسولؐ کی زبان سے یہ کہلوایا کہ "آدم نے اپنی اولاد میں مجھ پر فخر کیا تھا اور میں اپنی اولاد میں ابو حنیفہ پر فخر کرتا ہوں۔"

یا دوسرے لفظوں میں انبیاء کرام مجھ پر نازاں ہیں اور میں ابو حنیفہ پر، جو ان کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو ان کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔" (الدر المختار فی شرح تنویر الابصار ۱/۵۲-۵۴)

"حضرت عیسیٰ ابو حنیفہ کی شریعت پر عمل کریں گے۔ ان کے مذہب پر عمل کرنے والا نجات یافتہ ہے۔ وہ قرآن کے بعد رسول اکرمؐ کا ایک معجزہ ہیں۔" (الدر المختار ۱/۵۲-۵۴)

ابو حنیفہ کی کرامت یہ ہے کہ حضرت خضرؑ ان کے پاس پانچ سال تک تحصیل علم کرتے رہے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو خضرؑ نے بارگاہِ احدیت میں دعا کی کہ خدایا اگر تیری نظر میں میری کوئی حیثیت ہے تو ابو حنیفہ کو اجازت دے دے کہ مجھے قبر سے اپنے علوم کی تعلیم دیں۔ قدرت نے یہ دعا قبول کر لی اور وہ پچیس سال تک ان کی قبر سے علوم حاصل کرتے رہے۔ (الیاقوت لابی الفرج علی بن الجوزی ص۱۴)

میرا خیال ہے کہ اگر خود ابو حنیفہ بھی اس روایت کو سنتے تو راوی پر توہینِ انبیاء کی حد جاری کر دیتے اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ کرتے کہ وہ اپنی حالت سے بہتر واقف تھے۔

دوسری طرف شافعی شاعر نے اعلان کیا کہ شافعی کی مثال علماء میں وہی ہے جو ستاروں میں چاند کی مثال ہے۔ ابو حنیفہ ان کے سامنے اسی طرح ہیں جیسے روشنی کے سامنے تاریکی۔

مالکیوں نے اعلان کیا کہ امام مالک کی ران پر قلمِ قدرت نے یہ نوشتہ لکھ دیا تھا "مالك حجة الله فی ارضه" (شرح تائیہ ابن فارض الشرنوبی) وہ ہر مالکی کی قبر میں آکر اسے منکر و نکیر

کے سوال سے بچاتے ہیں۔ (مشارق الانوار عدوی ص۲۸۵) انھوں نے اپنی کتاب موطاء کو پانی میں ڈال دیا لیکن تر نہ ہو سکی۔ شاعر کہتا ہے کہ مالک سے انحراف کرنے والا ہالک ہے۔

حنبلیوں کا بیان ہے کہ مذہب حنبلی سے انحراف کرنے والا بدعتی ہے ـــــ جیسا کہ امام شافعی کے نام سے نقل کیا کہ احمد بن حنبل کا دشمن کافر ہے اس لئے کہ ان کا دشمن سنّت کا دشمن ہے اور سنّت کا مخالف صحابۂ کرام کی توہین کرنے والا ہے اور صحابہ کی توہین کرنے والا رسول اکرمؐ کا دشمن ہے اور رسولؐ کا دشمن اللہ کا منکر ہے۔ (طبقات حنابلہ ۱ ص۱۳)

ظاہر ہے کہ ہم امام شافعی کے اس قول کی تائید نہیں کر سکتے ہیں اور نہ ان کی طرف نسبت ہی کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حضرت علیؑ کے دشمن کو بھی کافر نہیں کہتے ہیں بلکہ یہ لوگ تو متوکل کو ناصر السنۃ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے لئے روایتوں کا انبار لگاتے ہیں۔ جب کہ اس کا عالم یہ تھا کہ حضرت علیؑ کا کھلم کھلا دشمن تھا۔ عمر بن فرخ، ابو السمط، عبداللہ بن محمد بن داؤد، علی بن الجہم وغیرہ کی تعظیم کرتا تھا۔ اور اس کی تمام تر دلچسپی یہ تھی کہ حضرت علیؑ کی توہین کی جائے۔ وہ تو دوستانِ علیؑ کے قتل و غارت کو بھی باعثِ مسرت سمجھتا تھا۔

لیکن اس کی بدکرداری کے باوجود اسے اولیاء خدا، ناصرانِ سنّت، اہلِ جنّت اور ابوبکر و عمر بن عبدالعزیز جیسے لوگوں کی صف میں بٹھایا گیا ہے۔

ابن الجوزی نے بھی احمد بن حنبل کی محبت میں علی بن الجہم کو اہلِ سنّت میں شمار کیا ہے کہ وہ ابن حنبل کا دوست تھا۔ رہ گئی حضرت علیؑ کی دشمنی تو وہ اہلِ سنّت ہونے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد احمد بن حنبل ابوبکر سے بھی بہتر تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ پروردگارِ عالم ان کی قبر کی زیارت کیا کرتا ہے۔ (مناقب احمد بن الجوزی)

شیخ عبداللہ محمد بن ہروی کا بیان ہے کہ میں ابو حاتم بن جاموس کی ملاقات کی غرض سے رَے کی طرف چلا کہ سلطان محمود کا یہ حکم عام تھا کہ سب لوگ ابو حاتم کے سامنے اپنے عقائد پیش کریں۔ اتفاق سے اثنار راہ ایک شخص سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ تمھارا مذہب کیا ہے؟ میں نے کہا کہ حنبلی ہوں۔ وہ یہ سن کر حیرت زدہ ہو گیا اور کہنے

لگا کر اس مذہب کا تو نام بھی نہیں سنا ہے۔ اس کے بعد میرا دامن پکڑ کر کھینچتا ہوا ابو حاتم کے پاس لے گیا اور وہاں میرے مذہب کا ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، اس لئے کہ جو حنبلی نہیں ہے وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ ۲ ص۲۴۵)

گویا آپ کی نظر میں تمام اہلِ مذاہب کفار کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

کیا اس سے زیادہ غیر محتاط فتویٰ بھی ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے بعد بھی انسان عالم کہا جا سکتا ہے؟ سچ ہے تعصب کے احکام دنیا سے جداگانہ ہوتے ہیں۔

اس دور میں قضاوت کا عہدہ حکومت کی طرف سے صرف حنفیوں کو تفویض ہوتا تھا۔ قادر باللہ نے یہ ارادہ کیا کہ یہ عہدہ شافعیوں کے حوالے کر دے اور یہ سوچ کر اکفانی کے بجائے ابوالعباس احمد بن محمد بارزی شافعی کو قاضیٔ بغداد بنا دیا۔ ابو حامد نے اس کی اطلاع سلطان محمود کو کر دی اور چار طرف یہ خبر مشہور ہو گئی جس کی بنا پر مختلف فتنے رونما ہوئے اور آخر کار بادشاہ نے تمام اشراف کو جمع کر کے یہ بیان دیا کہ ابو حامد اسفرائنی نے مجھے نہایت ہی خلوص کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ قضاوت کو اکفانی سے منتقل کر کے بارزی کے حوالے کر دیا جائے لیکن اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ اس کی نیت خبیث تھی۔ وہ مجھے آباء واجداد کی سیرت سے ہٹانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اب کوئی شخص اس کے پاس نہ جائے، اس کے سلام کا جواب نہ دے اور ہر شخص اکفانی کو دوبارہ قاضی تصور کرے۔ (نظرۃ تاریخیہ احمد تیمور پاشا)

اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علماء حنفیہ منصب قضاوت کے کس قدر دلدادہ تھے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی تدبیریں کیا کرتے تھے۔

اس اختلاف ونزاع کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ اس دور میں کسی مذہب کو کامیاب بنانے کا بہترین وسیلہ یہی منصب قضاوت تھا کہ جسے یہ منصب مل گیا گویا اس کے مذہب کو معراج مل گئی اور یہی وجہ تھی کہ قاضی بھی اکثر اوقات مذہبی جھگڑے اٹھایا کرتے تھے اور اپنے مذہب کو آگے بڑھانے کے وسائل پیدا کیا کرتے تھے۔

شیخ الاسلام احمد بن ساعد حنفی نے قاضی نیشاپور ہونے کے بعد ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ خطیبوں نے برسرِ منبر دوسرے مذاہب پر لعنت کرنا شروع کر دی۔ (شذرات الذہب ۳ ص۲۱۱)

قاضی بکار نے یہ چاہا کہ جامع بنی امیہ میں کوئی حنفی امام مقرر کردیں۔ وہاں کے محراب و منبر پر ہمیشہ شافعیوں کا قبضہ رہتا تھا۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہی شافعیوں نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ قاضی کو معزول کیا گیا اور مسجد کا دروازہ بند ہوگیا۔ (طبقات الشافعیہ ۱ <u>۱۷۲</u>)

غالباً اس سلسلہ کا سب سے بڑا ہنگامہ ابن قشیری کا ہے کہ انھوں نے ۴۶۹ھ میں بغداد آکر مدرسہ نظامیہ میں حنبلیوں کی مذمت شروع کی۔ ان کو اہل تجسیم میں شمار کیا اور وزیر کے پاس ان کی شکایت لکھ بھیجی۔ ادھر قشیری کے اصحاب نے حنبلیوں کے سردار عبدالخالق ابن عیسیٰ پر حملہ بھی کر دیا اور طرفین میں باقاعدہ جنگ ہوگئی اور ابن قشیری کے شافعی اصحاب نے مدرسہ کے دروازہ بند کر دیئے۔ ابو اسحٰق شیرازی اور نظام الملک کو یہ حادثہ انتہائی ناگوار گذرا اور خلیفہ نے بھی چاہا کہ طرفین میں صلح ہو جائے۔ چنانچہ شافعیوں کی طرف سے قشیری اور حنبلیوں کی طرف سے ابوجعفر شریف وزیر کے سامنے حاضر کئے گئے۔ قشیری نے وزیر سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے درمیان صلح کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ صلح کسی حکومت، ملکیت یا قرضہ وغیرہ پر ہوتی ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ یہ ہمیں کافر سمجھتے ہیں اور ہم انھیں۔ اب صلح کس بات پر ہوگی۔ (ذیل طبقات الحنابلہ ابن رجب ۱ <u>۲۲</u>)

مذہبی کشمکش اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ علماء مذہب تبدیل کرنے میں سخت مصائب کا شکار ہو جاتے تھے۔ کوئی حنفی بننے پر سزا پاتا تھا اور کسی کی شافعی بننے پر مرمت کی جاتی تھی۔ (الدین الخالص ۲ <u>۳۵۵</u>)

ابوسعید متوفی ۵۶۲ھ حنفی سے شافعی بنے تو انھیں بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

سمعانی نے شافعی مذہب اختیار کیا تو فریقین میں جنگ چھڑ گئی اور فتنے کا سلسلہ عراق سے خراسان تک پہنچ گیا اور بالآخر بات بادشاہ وقت تک پہنچائی گئی۔ (طبقات الشافعیہ ۴ <u>۲۲</u>)

شیخ عبدالعزیز خزاعی نے مالکیت کو چھوڑ کر امام شافعی کا اتباع کر لیا۔

شیخ محمد بن عبداللہ متوفی ۲۶۸ھ نے بھی مالک سے شافعی کی طرف رجوع کر لیا۔

ابوجعفر بن نصر ترمذی متوفی ۲۹۵ھ نے حنفیت سے شافعیت کی طرف رجوع کیا۔

ابوجعفر طحاوی نے شافعیت سے حنفیت کی طرف۔

خطیب بغدادی متوفی ۴۹۳ھ حنبلی سے شافعی ہوئے۔
ابن فارس صاحب کتاب مجمل شافعی سے مالکی بنے۔
سیف آمدی متوفی ۶۳۱ھ حنبلی سے شافعی ہوئے۔
شیخ محمد بن دہان نحوی حنبلی سے شافعی ہوئے اور شافعی سے حنفی اور حنفی سے پھر شافعی۔
شیخ تقی الدین بن دقیق پہلے مالکی تھے بعد میں شافعی ہو گئے اور ہر ایک نے اپنے سابق مذہب والوں کی طرف سے کافی مصیبتوں کا سامنا کیا۔

باہمی تعصب اس منزل کو پہنچ گیا کہ مذہب کا چھپانا ایک ضروری کام ہو گیا۔ چنانچہ ابوبکر محمد بن الباقی حنبلی متوفی ۵۳۵ھ نے اپنے اشعار میں تین چیزوں کے اظہار کی ممانعت کی ہے۔ سن، مال اور مذہب۔ اس لئے کہ سن جھٹلایا جاتا ہے۔ مال سے حسد ہوتا ہے اور مذہب میں لوگ کافر بنائے جاتے ہیں۔

علامہ زمخشری کشاف ۲ ۴۹۸ میں اس اختلاف کی بے نظیر تصویر کشی فرماتے ہیں۔ ان کے اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اپنے مذہب کو ظاہر نہیں کر سکتا اور یہی مناسب بھی ہے اس لئے کہ اگر اپنے کو حنفی کہتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ شراب کو جائز جانتا ہے۔
شافعی کہتا ہوں تو کہا جاتا ہے کہ اپنی بیٹی سے نکاح کو مباح سمجھتا ہے۔
مالکی کہتا ہوں تو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کتے کے گوشت کو جائز جانتا ہے۔
اور اہل حدیث بتاتا ہوں تو بیوقوفی کا الزام آتا ہے۔

یہ مختصر خاکہ اس مذہبی تعصب کا ہے جسے حکومتوں نے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے بڑھا وا دیا اور اس کی آڑ میں شکار کھیلتے رہے۔ ہمارا مقصد ان اختلافات کا نقل کرنا نہیں تھا لیکن اسفرائنی جیسے غیر ذمہ دار افراد کی تردید کے لئے موضوع کو اس قدر طول دینا پڑا۔ موصوف کا خیال یہ ہے کہ چوں کہ شیعوں میں ہمیشہ باہمی اختلاف رہا ہے اور اہل سنت کے جملہ مذاہب ایک نقطہ پر متفق رہے ہیں۔ اس لئے مذہب شیعہ کو باطل اور مذہب اہل سنت کو حق سمجھنا چاہئے۔ ان کی اصل عبارت یہ ہے :-

"فصل دوئم طریق تحقیق نجات برائے اہل سنت والجماعت" (اہل سنت

ایک نقطہ پر متفق ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جو موجبِ کفر یا باعثِ برائت و بیزاری ہو، وہ اہلِ جماعت ہیں اور حق پر قائم ہیں۔ اللہ بھی حق والوں کا تحفظ کرتا ہے اور ان میں اختلافات نہیں پیدا ہونے دیتا ہے۔ ان کے علاوہ جتنے بھی مخالف فرقے ہیں ان میں سوائے باہمی بیزاری اور تکفیر کے کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ خوارج، رافضی اور قدریہ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے۔ حد ہوگئی کہ ایک مجلس میں سات قسم کے افراد جمع ہوئے اور سب ایک دوسرے کو کافر سمجھتے تھے۔ ان کی مثال یہود و نصاریٰ کی سی ہے کہ وہ لوگ بھی آپس میں ایک دوسرے کو لغو و مہمل سمجھتے ہیں۔

افسوس کہ اسفرائنی نے ان تمام حادثات کو نظرانداز کر دیا جن کی ہم نے ابھی ابھی نشاندہی کی ہے۔ انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ احمد بن حنبل نے قرآن کو مخلوق سمجھنے والے پر کفر کا حکم لگایا تھا۔

محمد بن یحییٰ دہلی متوفی ۲۵۵ھ نے فتویٰ دیا تھا کہ قرآن کو مخلوق کہنے والا کافر ہے۔ اس کی زوجہ اس سے جدا ہو جائے گی اور وہ اگر توبہ کرے گا تو خیر ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی اور اسے مسلمانوں کے مقبرہ میں جگہ نہیں دی جائے گی بلکہ جو اس مسئلہ میں غیر جانبدار ہوگا وہ بھی قریب قریب کافر ہوگا بلکہ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کے الفاظ آج مخلوق ہیں وہ بھی بدعتی ہے اور اسے بھی مسلمانوں کے مقبرہ میں دفن نہیں کیا جا سکتا ہے۔

احمد بن حنبل کی نظر میں ایسے لوگوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی اور اسی لئے وہ نہ ان لوگوں کی نماز جنازہ پڑھتے تھے اور نہ ان کے جنازہ کی مشایعت کرتے تھے۔

کافر سازی کا یہ سلسلہ اتنا عام ہوا کہ عورتوں تک بھی پہنچ گیا۔ چنانچہ خطیب نے تاریخ بغداد ۱۰۰/۷ میں نقل کیا ہے کہ ایک عورت قاضی عبداللہ بن محمد حنفی کے پاس یہ مقدمہ لے کر آئی کہ میرا شوہر قرآن کے بارے میں امیرالمومنین بادشاہِ وقت کے نظریہ سے متفق نہیں ہے لہٰذا مجھے اس سے الگ کر دیجئے۔

ان اختلافات نے نتیجۂ کار میں باہمی تکفیر کا ایک نیا باب کھول دیا۔

ایک جماعت کا خیال تھا کہ جو قرآن کو غیر مخلوق کہے وہ کافر ہے جس کے سربراہ ابن ابی داؤد وغیرہ تھے۔ واثق نے روم سے چار ہزار قیدی گرفتار کئے اور ان کی رہائی میں یہ شرط کر دی کہ جو قرآن کو مخلوق مانے گا اس کو آزاد کر دیا جائے گا اور جو اس سے انکار کرے گا وہ قید میں رہے گا۔ یعنی اس پر کفر کے احکام باقی رہیں گے۔ (طبقات الشافعیہ ۲ ۲۲) (تاریخ یعقوبی ۳ ۱۹۴)

احمد بن نصر، واثق کے پاس آئے تو اس نے پوچھا کہ قرآن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ احمد چونکہ غیر مخلوق سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے کہا وہ کلام اللہ ہے اور اسی پر اڑ گئے تو بعض حاضرین نے کہا کہ ان کا خون حلال ہے۔ ابن ابی داؤد نے کہا کہ ان کے دماغ میں خلل ہے۔ اس لئے انھیں توبہ کی مہلت دی جائے۔ واثق نے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ کافر ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہہ کر اٹھا کہ میرے ساتھ کوئی نہ آئے۔ میں اس کافر کو قربۃً الی اللہ قتل کروں گا۔ یہ ایسے خدا کی پرستش کرتا ہے جسے ہم نہیں پہچانتے ہیں۔ یہ کہہ کر احمد کو گرفتار کرا کے بٹھایا اور حکم دیا کہ ان کی گردن ایک رسی میں باندھ کر کھینچی جائے۔ جب لوگوں نے اس حکم پر عمل کیا تو اس نے ان کی گردن اڑا دی اور سر بغداد بھیج دیا۔ (شذرات الذہب ۲ ۱۶۷)

مسلمانوں کے یہی وہ اختلافات تھے جنھوں نے ایک طرف امت کے اتحاد کو پاش پاش اور اس کے شیرازہ کو منتشر کر دیا اور دوسری طرف دشمنوں کو یہ موقع دیدیا کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو کر ان کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔

ہمارا مقصد ان بیانات سے صرف ان اسباب کی نشاندہی کرنا ہے جن کی بنا پر آج اسلامی معاشرہ اس انحطاط اور پستی کا شکار ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جب عام مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا یہ حال ہو گا تو پھر شیعہ سنی جھگڑے کی داستان تو اور بھی ہولناک، قیامت خیز اور الم انگیز ہو گی۔ اس میں فتنوں کی بھڑکتی ہوئی آگ، مسلمانوں کے بہتے ہوئے خون اور جلتے ہوئے مکان سب ہی ہوں گے۔ ہمارا مقصد ان اختلافی مسائل کا ذکر کرنا نہیں ہے اس لئے کہ ان سب کی بنیاد مسئلہ امامت جیسے چند بنیادی مسائل پر ہے۔ جن کی وجہ سے شیعوں کے خلاف ایک پورا محاذ تیار ہو گیا۔ تہمتیں رکھی گئیں، الزام تراشے گئے اور علم و دیانت کے حقوق کو پامال کیا گیا۔ یہ داستان آیندہ وضاحت کے ساتھ بیان کی جائے گی۔ اس وقت صرف ان حادثات کی طرف اشارہ کرنا ہے جو

ہزاروں افراد کا خون بہا کر چلے گئے۔ عاشور کا غم اور غدیر کی مسرت جو شیعوں کا ایک بنیادی فریضہ تھا مخالفین نے اسے بھی بدعت کے سیلاب میں بہا دیا اور اس کے ساتھ فریقین کے نہ جانے کتنے خون بھی بہہ گئے۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ۱۱ ۲۳۵) یہ اور بات ہے کہ خود اہلسنت نے بھی عاشور کے مقابلہ میں مصعب ابن زبیر کا غم منایا اور غدیر کے مقابلے میں یوم الغار (غار ثور) کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ سیکڑوں آدمیوں پر نوحہ پڑھا گیا اور اسے بدعت نہیں سمجھا گیا۔

محمد بن یحییٰ نیشاپوری نے احمد بن حنبل کی موت پر ایک عام حکم لگا دیا کہ بغداد کے ہر گھر میں ان کا ماتم کیا جائے۔ (طبقات الحنابلہ ۲ ۵۱) چنانچہ وہ ماتم بھی ہوا۔ غم بھی منایا گیا، ایک مدت تک قبر پر اجتماع بھی رہا اور مجالس بھی برپا ہوئیں۔

نوحہ و ماتم کا یہ سلسلہ ابن حنبل ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے علاوہ بھی تاریخ میں متعدد مثالیں ملتی ہیں:۔

۱۔ ابو الفتح اسماعیل بن سلطان محمود نے ۵۶۷ھ میں رحلت کی تو گلی کوچوں میں ان کا ماتم ہوا اور بے پناہ غم منایا گیا۔ (شذرات الذہب ۶ ۱۱۲)

۲۔ ابن تیمیہ نے ۷۲۸ھ میں انتقال کیا تو ان کے جنازہ میں دو لاکھ مرد اور پچاس ہزار نوحہ کناں عورتیں شریک ہوئیں۔ ان کے غسل کے پانی کو تبرکاً پیا گیا۔ بیر کی پتیوں کو برکت کے لئے بانٹ لیا گیا اور ان کے ایک ایک مال پر سیکڑوں درہم و دینار لٹ گئے۔ جنازہ چلا تو منادی یہ آواز دیتا ہوا چلا کہ اہلِ سنت کے جنازہ ایسے ہوتے ہیں۔ تختۂ غسل پر رکھا گیا تو مردوں اور عورتوں نے مل کر بوسے دیئے۔ (تاریخ ابن کثیر ۱۴ ۱۳۸) شمس الدین ذہبی جیسے افراد نے ان کا مرثیہ بھی لکھا۔ (العقود الدریہ فی مناقب ابن تیمیہ ۳۹۹)

۳۔ احمد بن سلطان ملک شاہ نے ۴۸۱ھ میں انتقال کیا تو سات دن تک ان کا ماتم ہوتا رہا۔ دروازے سیاہ کر دیئے گئے۔ بازاروں میں عورتوں نے نوحہ پڑھا اور کوئی آدمی گھوڑے پر سوار نہیں ہوا۔

۴۔ شیخ الحرمین کا انتقال ہوا تو ان کے شاگردوں نے سڑکوں پر عورتوں کی طرح نالہ و شیون کیا اور سال بھر تک یہ ماتم رہا۔ (طبقات الشافعیہ ۳ ۲۵۹)

٥۔ ٦٠٧ھ میں ابو عمر منبلی نے انتقال کیا تو اس پر مرد و عورت سب نے مل کر ماتم کیا۔ مسجد میں غسل دیا گیا۔ عورتوں نے اپنے دوپٹے اور مردوں نے اپنے عمامے اس پانی سے تر کر لئے اور برکت کے لئے کفن کے ٹکڑے حاصل کرنے پر ٹوٹ پڑے۔ قریب تھا کہ لاش برہنہ ہو جائے اگر حکومت نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی۔ تلوار سے مجمع کو پیچھے ہٹایا گیا، بقول ابن عماد اگر حکومت نہ ہوتی تو کفن کا کوئی ٹکڑا قبر تک نہ پہنچ سکتا۔ (شذرات الذہب ٣٠٣)

٦۔ مسترشد عباسی نے ٥٢٩ھ میں رحلت کی تو عورتوں نے برہنہ سر سڑکوں پر اس کا ماتم کیا اور مردوں نے گریبان چاک کر ڈالے۔ (تاریخ دول اسلام ذہبی ١٨٢)

اس کے علاوہ غم و الم، نوحہ و ماتم کی ایک داستان ہے۔ جس کا اندازہ تاریخ کے اوراق سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ پھر ان معاملات میں شیعوں سے اتنا سخت مواخذہ کیوں ہوا۔ ان کے سلسلہ میں اتنے حادثات کیسے رونما ہوئے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تمام تر حکومتوں کی خوشامدوں کا ہاتھ تھا۔ شیعہ دشمنی اور تشیع سے علیحدگی ایک فریضہ بن گئی تھی۔ شیعوں سے مشابہت ایک جرم قرار پا گئی تھی۔

زرقانی نے مواہب لدنیہ میں حضرت علیؑ کی روایت کی بنا پر پیغمبر اسلامؐ کے عمامہ کی شان بیان کرتے ہوئے حافظ عراقی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عمامہ کا انداز فقہاء امامیہ نے لیا ہے لہذا اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

یعنی شیعوں کی مشابہت کی وجہ سے رسول اللہ کے شعار کو بھی ترک کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ہزار ثبوت میں ایک اہم ثبوت ہے اس بات کا کہ اس دور میں شیعوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور یہ بھی کوئی عجیب بات نہ تھی، اس لئے کہ تشیع میں حکومت کی ناراضگی اور اس کے نتیجہ میں جان و مال کی بربادی یا قید و بند کی زندگی تھی۔ ضرورت تھی کہ ان کی مخالفت کر کے حکومت کو راضی کیا جائے اور تشیع کی تہمت کا خواب بھی نہ دیکھا جائے۔

خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے خواب میں حضرت علی علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے قریب جانے کی ہمت نہ کی۔ اس کے ساتھی نے ٹوکا تو اس نے جواب دیا کہ

ڈرتا ہوں کہ کہیں تشیع سے بدنام نہ ہو جاؤں۔

یہ تھی حکومت کی وہ کارگذاری جہاں اپنے مصالح کے لئے افتراق و اختلاف کے شعلے بھڑکائے جاتے تھے تاکہ اخوت و اتحاد سے اپنے ذاتی اغراض پامال نہ ہونے پائیں۔

یہ سچ ہے کہ ہر دور میں کچھ حق کے پرستار بھی رہے ہیں اور انھوں نے امت کو اس اختلاف کے نتائج سے آگاہ بھی کیا ہے۔ لیکن ایسے انتشار، تعصب، عداوت اور نزاجیت کے ماحول میں ان کی آواز کہاں تک پہنچ سکتی تھی۔ جہالت نے ان پر ایسے افراد مسلط کر دیئے تھے جو رحم و کرم کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ اب ان کے سامنے ذلتیں تھیں، تلوار یں تھیں۔ ان کے خون تھے اور زمین! ان کے سر تھے اور ٹیلے! مسلمانوں کے دل تھے اور رعب و ہیبت! کسی میں بات کرنے کی جرأت یا کلمۂ توحید کے نشر کرنے کی طاقت نہ تھی! وہ دن جا چکے تھے جب حیات کو پست سمجھ کر شہادت کی تمنا میں موت کا استقبال کرتے تھے۔ جب ان کے قدموں میں دنیا کے شہر تھے اور ان کے سامنے بڑے بڑے جابروں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ اب تو ان میں یہ دم بھی نہیں رہ گیا تھا کہ اپنے نفس سے دفاع کرتے! اب ایک تاتاری پوری جماعت کو قتل کر سکتا تھا۔ ایک عورت گھر میں گھس کر ایک جماعت کو تہِ تیغ کر سکتی تھی اور ان میں دفاع کی طاقت نہ تھی۔ ایک شخص سو کو مار سکتا تھا اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ عالم یہ تھا کہ ایک تاتاری نے ایک مسلمان کو گرفتار کیا اور جب اسے قتل کرنے کے لئے کوئی چیز نہ ملی تو اس نے کہا کہ تم اسی جگہ لیٹے رہو، میں کوئی چیز لے کر آتا ہوں۔ وہ شخص اسی مقام پر لیٹا رہا یہاں تک کہ اس نے آکر قتل کر دیا۔ (المد والجزر ابوالحسن مناوی ۳۷) یہی وہ باتیں ہیں جن سے مسلمان کا دل رنجیدہ ہوتا ہے اور اس کا دم ہونٹوں تک آجاتا ہے۔ اس لئے کہ آج ہمارا مقابلہ فاسد عقائد، غلط خیالات اور گندے نظریات سے ہے۔ آج اگر ہم نے اسلامی تعلیمات کا سہارا نہ لیا اور اتحاد و اخوت پر عمل نہ کیا تو ہم خود ہی اپنے لئے بہت بڑا خطرہ بن جائیں گے۔ دشمن ہمارے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر ہمارے معاشرہ کو تباہ کر دے گا۔ ہماری دینی و اخلاقی تعلیم کو مسخ کر دے گا اور ہمارے درمیان ایسی نامعقول تعلیم رائج کر دے گا جس کا مقابلہ اتحاد کے علاوہ کسی اور طاقت سے نہیں ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اسلام کو

سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے تعلیمات کو ان مرکزوں سے حاصل کریں جن کے اتباع کا قرآن مجید نے حکم دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔

---

# مذاہب کی نشر و اشاعت

# مذاہب کی نشر و اشاعت

مذاہب اربعہ کے رفتہ رفتہ شہرت کی بلندیوں پر قدم رکھا۔ چوتھی صدی ہجری آتے آتے گذشتہ صدیوں کے تمام مذاہب کے نقوش کے دھندلے پڑگئے اور یہی چاروں مذاہب حکمران رہ گئے۔ صرف ایک مذہب شیعہ ایسا تھا جو ان تمام رکاوٹوں کے باوجود اپنی روحانی طاقتوں سے آگے بڑھتا رہا اور کسی منزل پر نہ ٹھہر سکا۔

مقدسی نے چوتھی صدی کے حالات اس انداز سے بیان کئے ہیں :۔

صنعاء اور عمان کے اطراف میں غالیوں کا غلبہ تھا۔

عمان اور جہر وغیرہ کے صاحبِ فکر شیعہ تھے۔

خود اصل صنعاء پر حنفیوں کا قبضہ تھا۔

نجد و یمن کے اطراف میں سفیان کا مذہب رائج تھا۔

بغداد میں حنبلی اور شیعہ غالب تھے لیکن مالکی اور اشعری بھی تھے۔

کوفہ میں شیعوں کا اقتدار تھا لیکن کناسہ اہلِ سنت کے ہاتھ میں تھا۔

اہلِ بصرہ قدری تھے۔ شیعہ اور حنبلی بھی وہاں پائے جاتے تھے۔

بغداد میں معاویہ دوست غالیوں کا بھی وجود تھا۔ چنانچہ مقدسی ہی نے بغداد کی ایک مسجد میں ایک شخص کو یہ روایت نقل کرتے سنا کہ "اللہ روزِ قیامت معاویہ کو اپنے پہلو میں بٹھائے گا اور ان تمام مخلوقات کے سامنے دلہن بنا کر پیش کرے گا" کو یہ سن کر انھیں غیظ آگیا خطیب سے

کہنے لگے کیا یہ علیؑ سے جنگ کرنے کا صلہ ہے۔ تو جھوٹا اور بے ایمان ہے۔ مقدسی کا یہ کہنا تھا کہ مسجد میں ایک شور برپا ہوگیا۔ پکڑو پکڑو یہ رافضی ہے۔ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے لیکن بعض لوگوں نے مجھے پہچان لیا اور اسی لئے بلائل گئی۔

موصل وغیرہ میں اہل سنت کا مذہب رائج تھا۔

عمان پر معتزلہ کا غلبہ تھا۔

اہل شام اہلسنت تھے۔

طبریہ، نابلس اور عمان کی اکثریت شیعہ تھی۔ مالکی کوئی نہ تھا۔ لیکن عمل اصحاب حدیث کے مذہب پر ہوتا تھا۔

اہل مصر شام والوں کے ہم مذہب تھے لیکن اکثر تعداد مالکی تھے۔ اس لئے کتے پالا کرتے تھے اور امام کے آگے نماز پڑھتے تھے۔

فسطاط میں ظاہری مذہب تھا۔

مغرب میں تین قسم کے مذہب تھے۔

اندلس میں مالکی مذہب تھا اور نافع کی قرأت، ان کا ایمان اللہ کی کتاب اور مالک کی موطا پر تھا۔ یہ لوگ حنفی اور شافعی کو شہر بدر کر دیتے تھے اور معتزلہ و شیعہ کو مستحق قتل سمجھتے تھے۔

باقی مغرب میں مذہب حنفی و مالک رائج تھا۔ مالکی شافعی کو برا سمجھتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ شافعی نے مالک سے علم لے کر ان کی مخالفت کی ہے۔

خراسان کے اطراف میں شیعہ اور معتزلہ آباد تھے لیکن غلبہ حنفیوں کا تھا۔

کورۃ الشاش میں شافعی بھی تھے اور ایک قوم عبداللہ سرخسی کے مذہب پر بھی تھی۔

رحاب کے مذاہب مستقیم تھے لیکن اہل حدیث حنبلی تھے۔

دبیل میں حنفی مذہب غالب تھا۔

رَے کے مذاہب مختلف تھے۔ غلبہ حنفیوں کے ہاتھ میں تھا۔ حنبلی بھی بہت تھے۔

اہل قم شیعہ تھے۔

دینور میں سفیان ثوری کے پیرو تھے۔

خوزستان کے مذاہب بھی مختلف تھے۔

اہلِ اہواز و رامھرمز و دورق حنبلی تھے۔

نصف اہواز شیعہ تھا۔ اس میں حنفی بھی تھے اور مالکی بھی۔

فارس میں اصحاب حدیث اور اصحاب ابو حنیفہ کا دور دورہ تھا۔ داؤدیہ فرقے کے دروس و مجالس بھی تھے اور قضا تیں انھیں کے ہاتھ میں تھیں۔

کرمان میں شافعیوں کا غلبہ تھا۔

سندھ میں اصحاب حدیث کی اکثریت تھی۔ قاضی ابو محمد منصور مذہب داؤدی کے امام تھے۔

اہلِ ملتان شیعہ تھے اذان میں حی علی خیر العمل کہتے تھے اور اقامت میں دو دو فصلیں قرار دیتے تھے۔ قصبات میں حنفی فقہاء بھی تھے لیکن مالکی، معتزلی یا حنبلی کا کوئی اثر نہ تھا۔

(احسن التقاسیم شمس الدین محمد ابن احمد بشاری مطبوعہ سنہ ۱۹۰۹ء مطبع بریل)

---

# عصرِ حاضر

آج کے دور میں مذاہبِ اربعہ کی رفتار اشاعت کے بارے میں علامہ احمد تیمور پاشا اپنی کتاب نظرۃ تاریخیہ ص۱۲ پر یوں رقم طراز ہیں :-

مغربِ اقصیٰ و جزائر اور تیونس میں مالکی مذہب غالب ہے۔

طرابلس میں مالکیوں کی اکثریت اور حنفیوں کی قلت ہے جو ترکوں کے قدیم خاندان کے باقی ماندہ افراد ہیں اور جن کی اکثریت تیونس میں ہے۔ اسی لئے وہاں کی قضاوت حنفی و مالکی دونوں کے ہاتھ میں ہے اور باقی جگہیں مالکیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

حاضرہ میں مفتیٔ اعظم حنفی ہیں جن کا لقب شیخ الاسلام ہے۔ مالکی کا درجہ اس کے بعد ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کو بھی کبھی کبھی شیخ الاسلام کہہ دیتے ہیں۔ باوجودیکہ یہاں حنفیوں کی قلت تھی۔ لیکن جامعہ زیتونہ کا قانون یہ ہے کہ اس کے آدھے مدرس حنفی ہوں اور آدھے مالکی، جس کا سبب صرف یہ ہے کہ مذہب حنفی بڑے خاندانوں نے اختیار کیا تھا۔

مصر میں مرکزیت شافعیوں کی ہے لیکن اطراف میں مالکی بھی ہیں۔ حنفیوں کی کثرت اور انھیں کی حکومت ہے۔ حنبلی نہ ہونے کے برابر ہیں۔

شام میں آدھے حنفی ہیں، چوتھائی شافعی اور چوتھائی حنبلی۔

فلسطین میں اکثریت شافعیوں کی ہے۔ اس کے بعد حنبلی، اس کے بعد حنفی، اس کے بعد مالکی۔

عراق میں اکثریت حنفیوں کی ہے اور اسی کے لگ بھگ شافعی بھی ہیں مالکی اور حنبلی کم ہیں۔

ترک علاقے میں حنفی ہیں۔

کرد شافعی مذہب کے ہیں۔

اہل فارس میں بھی اکثریت انھیں کی ہے۔ تھوڑے سے حنفی بھی ہیں۔

افغان حنفی و شافعی ہیں اور تھوڑے سے حنبلی۔

ترکستان غربی میں حنفی زیادہ ہیں اور شرقی میں شافعی۔ بعد میں حنفیوں کا غلبہ اس لئے ہوگیا کہ قفقاز وغیرہ کے علماء نے کافی جدوجہد کی۔

پاک و ہند حنفی ہے۔ شافعی کم اور دیگر مذاہب بھی ہیں۔

ہند چینی میں شافعی ہیں۔

یہی حال آسٹریلیا کا ہے۔

برازیل میں پچیس ہزار حنفی مسلمان ہیں۔

امریکہ میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار مختلف مذہب کے مسلمان ہیں۔

حجاز میں شافعی و حنبلی زیادہ ہیں۔ بعض شہروں میں حنفی و مالکی بھی ہیں۔

یمن، عدن اور حضرموت میں شافعی ہیں۔ عدن کے بعض علاقوں میں حنفی بھی ہیں۔

عمان میں غلبہ خوارج کا ہے۔

قطر اور بحرین مالکی ہے۔ کچھ تھوڑے سے حنبلی بھی ہیں جو نجد سے آگئے ہیں۔

احسار میں اکثریت حنبلی و مالکی کی ہے۔

کویت مالکی ہے۔

یہ تفصیل احمد تیمور پاشا نے مذاہب اربعہ کے بارے میں ذکر کی ہے لیکن چونکہ موصوف نے مذہب شیعہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے اس لئے ہم ان مذاہب سے فرصت پانے کے بعد اس کی داستان بھی سنائیں گے۔

ہم پہلے ہی یہ بتا آئے ہیں کہ ان مذاہب کی ترویج میں زیادہ ہاتھ حکومت کا تھا جس کے زیر اثر مذہب کو آگے بڑھانے کے لئے مدرسے قائم کئے جاتے تھے اور ان کا کام ابتدا ہی سے ان مذاہب کو موجودہ نسل کے رگ و پے میں دوڑا دینا تھا۔

———————

# ترویجِ مذاہب کے مدرسے

عہدِ عباسی میں بغداد ایک ایسی مرکزی آبادی کی شکل اختیار کر چکا تھا جس میں مذاہب اربعہ کی تعلیم کے لئے مختلف مدرسے تھے۔ طلاب علم کے اخراجات برداشت کئے جاتے تھے نظام الملک ہر سال چھ لاکھ دینار خرچ کرتے تھے۔ مقتدر عباسی کے وزیر ابوالحسن علی بن محمد کی طرف سے ۵ ہزار طلاب کی کفالت ہوتی تھی۔ اطرافِ عالم کے طلاب علم کھنچ کھنچ کر آرہے تھے۔ ان مدارس میں قابلِ ذکر مدرسے یہ تھے:۔

۱۔ نظامیہ: جسے ۴۵۷ھ میں دجلہ کے کنارے نظام الملک طوسی نے تعمیر کیا تھا۔ اور اس کے اطراف میں مختلف بازار، مکانات اور حمام بنا کر وقف کر دیئے تھے۔

۲۔ تاجیہ: جسے تاج الدین ابوالغنائم نے ۴۸۲ھ میں بنوایا تھا۔

۳۔ تتوشیہ: جسے خمارتگین خادم تتش بن الب ارسلان بن داؤد بن سلجوق نے خاص حنفیوں کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

۴۔ باب الازج: جو ثقۃ الدولہ ابی الحسن علی بن محمد قزوینی کے لئے بنا تھا۔

۵۔ مدرسہ ابن دینار: جو فقیہ شافعی ابراہیم بن دینار بغدادی کے لئے تعمیر ہوا تھا۔

۶۔ مدرسۂ زیرک: جو خاص حنفیوں کے لئے تھا۔

۷۔ مدرسہ ستر ابیہ: اسے شرف الدین اقبال ستر ابی نے ۶۲۸ھ میں سوق العجم میں تعمیر کرایا تھا۔

۸۔ بشیریہ : بغداد کے مغرب میں مذاہب اربعہ کی تعلیم کے لئے مستعصم کے دور میں بنا۔

ان تمام مدارس سے زیادہ اہم مدرسہ مستنصریہ تھا جس کی حیثیت ان تمام مدرسوں کے لئے ایک یونیورسٹی کی تھی جہاں علماء اعلام تعلیم پاتے تھے جس کا ذکر سیوطی (تاریخ الخلفاء ص۳۵۰)، ابن بطوطہ اور ابن فوطی نے کیا ہے۔ (الحوادث الجامعہ ص۵۳)

مصر میں ان مدارس کی تعداد نوے سے کسی طرح کم نہ تھی جن میں بعض یہ ہیں :۔

۱۔ مدرسۂ فائزیہ : جسے شرف الدین بن صاعد نے ۲۳۶ھ میں شافعیوں کے لئے بنوایا تھا۔

۲۔ مدرسۂ قطبیہ : جسے قطب الدین خسرو نے ۵۷۰ھ میں شافعیوں کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

۳۔ مدرسۂ سیوفیہ : جسے صلاح الدین ایوبی نے ۵۷۲ھ میں حنفیوں کے لئے بنوایا تھا اور اس پر ۳۲ دکانیں بھی وقف کی تھیں۔

۴۔ مدرسۂ فاضلیہ : جسے قاضی فاضل عبدالرحیم نے ۵۸۰ھ میں شافعی اور مالکی فقہاء کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

۵۔ مدرسۂ محلی : جسے برہان الدین ابراہیم بن علی محلی نے تعمیر کرایا تھا۔

۶۔ مدرسۂ فارقانیہ : یہ ۶۷۶ھ میں حنفیوں اور شافعیوں کے لئے بنا تھا۔

۷۔ مدرسۂ شریفیہ : جسے ایوبی حکومت کے دور میں ۶۱۲ھ میں شافعیوں کے لئے مصر کے ایک رئیس نے بنوایا تھا۔

۸۔ مدرسۂ صالحیہ : جسے ۶۳۹ھ میں نجم الدین ایوب نے تمام فقہاء کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

۹۔ مدرسۂ کاملیہ : جسے سلطان ناصر الدین محمد بن ملک عادل نے شافعیوں کے لئے تعمیر کرایا تھا۔

۱۰۔ مدرسۂ ظاہریہ : یہ صرف شافعیوں اور حنفیوں کے لئے تھا۔

۱۱۔ مدرسۂ قطبیہ : یہ ساتویں صدی میں مونسہ خاتون کی وصیت سے تعمیر ہوا تھا۔ (خطط مقریزی ج ۴ ۱۹۱ تا ۲۶۲)

اس کے علاوہ مختلف مقامات پر نہ جانے کتنے مدارس تھے جو حکومت کے زیر سایہ مذاہب اربعہ کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مذہب اہلبیتؑ بجائے حکومت کی تائید کے ہر سلطنت سے ٹکراؤ کا شکار تھا۔ چار طرف سے حملے ہو رہے تھے لیکن یہ اپنے ٹھوس حقائق کا سہارا لئے ہوئے وصیت پیغمبرؐ کے بھروسے علوم آل محمدؐ کو نشر کر رہا تھا اور آج بھی اپنی روحانی طاقت سے روئے زمین پر پھیل پھول رہا ہے۔ ؎

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

---

# مذہبِ جعفری اور اس کی اشاعت کے اسباب

یہ مذہب ان اہلبیتؑ کا ہے جنھیں اللہ نے تطہیر کا مرکز بنا کر تمام برائیوں سے دور رکھا ہے۔ اس کے نشر و اشاعت کے اسباب صرف یہ ہیں کہ اس کا سرچشمہ قرآنِ کریم اور سنّتِ پیغمبرؐ ہے۔ پیغمبرؐ ہی نے اس کی تخم ریزی کی ہے اور انھیں کی تعلیمات سے اسے پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے۔ یہ وہ پہلا مذہب ہے جس پر دورِ صحابہ میں بھی عمل ہوا اور جس کی اشاعت میں حضرت ابوذرؔ، سلمانؔ، مقدادؔ اور عمار بن یاسرؔ جیسے اصحاب نے حصّہ لیا۔

امام صادقؑ کے ساتھ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ آپ کو اموی حکومت کے آخری نفس اور عباسی سلطنت کے لڑکپن کے درمیان اتنا موقع مل گیا کہ آپ الٰہی احکام اور پیغمبری تعلیمات کو اپنے آباء و اجداد کے واسطے سے نقل کر سکیں۔ آپ کا ذکر اس دور میں اس لئے زیادہ ہوتا تھا کہ آپ نے دینی حقائق کی تائید اور جعلی اور مشتبہ روایات کی تحقیق کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تھا طلابِ علم آپ کے مدرسہ کی چوکھٹ پر جمع ہوتے تھے اور اربابِ ذوق آپ کی بارگاہ میں کھنچ کھنچ کر آتے تھے۔ انھیں خدمات کا نتیجہ تھا کہ اس دور کی اصطلاح کے مطابق آپ کے احکام کو مذہبِ جعفر صادقؑ کا نام دے دیا گیا۔

مذہب جعفری اپنی اشاعت کے اسباب میں دیگر مذاہب سے بالکل الگ تھا۔ اس کے ساتھ نہ مادّی طاقت تھی اور نہ حکومت کی کمک۔ اس میں کچھ ذاتی صلاحیتیں تھیں کہ اگر اس کے اصول میں پاکیزگی، تعلیمات میں روحانی طاقت اور اس پر اللہ کی خاص نظرِ عنایت نہ ہوتی تو حکومتیں

اسے پامال کر ڈالتیں۔ دیگر مذاہب کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں شہرت اور گمنامی کا سبب صرف حکومت کی مداخلت تھا۔ حکومت نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ اپنے پسندیدہ مذہب کو رواج دیا جائے اور اس کے خلاف مذاہب کو مٹا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مشہور مذاہب بھی حکومتی مدد نہ ملنے سے گوشۂ گمنامی میں جا بسے۔

---

مذہبِ اہلبیتؑ کو مٹانے کی کوشش مختلف ادوار میں کی گئی۔ ہر حکومت نے ایک خاص سبب سے اہلبیتؑ کا مقابلہ کیا اور ان کے مذہب کی اشاعت کو روکنا چاہا۔ اموی دور میں مخالفت کے تین اسباب تھے

۱۔ خانوادۂ پیغمبرؐ سے ذاتی عداوت جو انھیں ورثہ میں ملی تھی اور جس میں ان کا ظاہری اسلام کوئی تغیر نہ پیدا کر سکا تھا بلکہ اسلام کی اشاعت اور اس میں مجبوراً داخلہ نے ان کے آتشِ بغض و حسد کو اور بھی ہوا دے دی تھی۔

۲۔ ان کے دورِ حکومت میں مذہبِ اہلبیتؑ کے رواج کا مفہوم ہی یہ تھا کہ ان کی سیاست مٹ کے رہ جائے۔ اس لئے کہ اہلبیتؑ کی سیاست میں عدل و مساوات اور اسلامی تعلیمات تھیں اور اموی سیاست میں ان باتوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

۳۔ بنی امیہ خلافت کے لئے اپنی نا اہلی سے بے خبر نہ تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ امت کی نگاہیں آلِ محمدؐ کی طرف اٹھ رہی ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر امورِ سلطنت اپنے فطری راستوں پر چلے تو خلافت بنی امیہ سے اس وقت تک کے لئے الگ ہو جائے گی جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گذر جائے۔ اس لئے ان لوگوں نے اپنی کامیابی کی تدبیریں شروع کر دیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کامیابی سے امت سیکڑوں سال پیچھے ہٹ گئی۔

---

حضرت علیؑ کے چاہنے والوں نے معاویہ کے دور میں مختلف قسم کے رنج سہے تکلیفیں برداشت کیں لیکن حکومت کے وسائل سے مرعوب نہ ہوئے۔ اور جب حضرت علیؑ کا نام لینا جرم ہو گیا تو آپ کی روایتیں ابوزینب کے نام سے نقل ہونے لگیں۔

معاویہ کی، ذکرِ علیؑ کو مٹا دینے کی کوشش کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اس نے زیاد کو کوفہ کا حاکم بنا دیا تاکہ وہ شیعیانِ علیؑ کی خانہ تلاشی لے کر انھیں آپ سے بیزاری پر آمادہ کرے۔

حجر بن عدی اور ان کے اصحاب کا قتل اس دعویٰ کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ معاویہ کے کرتوت کے سلسلہ میں ہم زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے ہیں صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ نتیجہ میں اس کی ساری محنتیں رائگاں ہی ہوئیں۔ اور مذہب اہلبیتؑ بنی امیہ کے دارالحکومت ہی میں پروان چڑھا۔

سب سے پہلے شام میں ایک محتاط جرأت مند صحابی حضرت ابوذر نے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ معاویہ کی سیہ کاریاں اور نظامِ اسلام کے مقابلہ میں اس کے تصرفات کو طشت از بام کیا۔ جس کے نتیجہ میں معاویہ نے عثمان سے فریاد کی اور حضرت ابوذر کو ربذہ میں غربت کی موت اختیار کرنا پڑی۔ معاویہ حضرت ابوذر کے اقدام کو برباد نہ کر سکا بلکہ اس کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور جیسے جیسے حکومتوں نے دباؤ ڈالا حضرت علیؑ کے چاہنے والوں نے اپنی تحریک کو اور تیز تر کر دیا۔ اب حکومت وقت کے خلاف احتجاج اور مخالفت کا عظیم مرکز کوفہ بن چکا تھا۔ جہاں حضرت حجر بن عدی اور ان کے اصحاب حق و انصاف کی آوازیں بلند کر رہے تھے اور بنی امیہ کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کر کے اسلام کی مخالفت کا انجام سمجھا رہے تھے۔

بنی امیہ کے رؤسا مغیرہ ابن شعبہ وغیرہ کا موقف یہ تھا کہ ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اس اقدام سے روک دیا جائے تاکہ معاویہ کو ان کی تائید بھی حاصل ہو جائے لیکن بات اس کے برخلاف ہوئی اور ابن سمیہ کے حضرت علیؑ سے برائت کرنے کے فرمان پر مخالفت کے جذبات اور بھی بھڑک اٹھے۔ لوگ حضرت علیؑ کے جہاد، ان کے خدمات اور پیغمبرؐ سے ان کی قرابت سے بخوبی واقف تھے۔ زیاد نے کوفہ میں حکومت پا کر اصحابِ امیرالمومنینؑ کی برائی کرنا شروع کر دی۔ جھوٹے گواہوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ دولت سے بڑے بڑے ایمان خریدے جا سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت حجر اور ان کے اصحاب انھیں گواہوں کے زیرِ اثر مقام مرج عذرا میں دردناک طریقہ سے زندگی کی آخری منزل تک پہنچا دیئے گئے۔

---

یہ ان لوگوں کی مصیبتوں کی داستان تھی جو اہلبیت کے طرفدار تھے۔ رہ گئے خود اہلِ بیت

علیہم السّلام تو اموی دورِ حکومت میں ان کے مصائب کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ لوگ ان کی مخالفت کو ذریعۂ تقرب بنائے ہوئے تھے۔ حکومت کی خوشامد میں جھوٹی روایتیں وضع ہو رہی تھیں۔ بیت المال سے ہزاروں لاکھوں کا سرمایہ لٹ رہا تھا۔ دین کے بیوپاری جو ہے کر اونٹ اور رائی کو پربت بنا رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ آبائی دشمنِ اسلام کو ایک روحانی پاک و پاکیزہ شخصیت بنا دیں تاکہ امّت اس پر اعتماد کرے اور عقیدے اس کے سامنے سر جھکا دیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہ تھا۔ چاہتے یہ تھے کہ یہ معاویہ کو وارث نبی بنائیں۔ ابوسفیان کو دین پر قربان ہو جانے والی شخصیت قرار دیں جیسے کہ امّت ان کے حالات سے بالکل بے خبر تھی۔

ظاہر ہے کہ ان باتوں کی قبولیت ایک ایسی بڑی طاقت کی محتاج تھی جو عقل پر غالب آجائے۔ تمیز کو چھین لے اور شعلۂ فکر کو خاموش کر دے۔ مال یہ سب کچھ کر سکتا تھا کہ اس کی کاٹ تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ معاویہ کی شان میں حدیثیں گڑھ کے اسے امینِ امّت بنا دیا گیا اور امیرالمومنینؑ کو اتنا گرایا گیا کہ آپ کو یہ فریاد کرنا پڑی۔ (زمانہ نے مجھے اتنا گرایا کہ میرا ذکر معاویہ کے ساتھ ہونے لگا)

ادھر ابوسفیان بھی ایک مقتدر صحابی شمار ہونے لگا اور اسلام کے پہلے مددگار، تبلیغ کے حامی، دعوتِ حق کے موید، تحفظِ پیغمبرؐ کے جاں نثار، عقیدہ و احساس کے مالک، قریش کے مومن، پیغمبرؐ کے موید، دین کے محافظ، اسلام کو عزت دینے والے، دشمن کی زبانِ مخالفت میں لگام لگانے والے ابوطالبؑ کو کافر کہا جانے لگا۔ ان کے کلمۂ شہادت کا انکار کر کے ان کی زندگی بھر کی محنتوں کو برباد کیا جا رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ بغیر علیؑ کی مخالفت کے کوئی انعام ممکن نہ تھا۔ اور ابوسفیان کا فرزند اس بات پر راضی نہ تھا کہ حضرت علیؑ کو اس سلسلۂ طاہرہ کی ایک کڑی قرار دیا جائے جسے جاہلیت کی نجاستیں مس نہ کر سکی ہوں حالانکہ وہ پیغمبرِ اسلام کے ساتھ ایک ہی گود (خاندان) کے پلے اور ایک ہی دودھ سے پرورش یافتہ تھے۔ معاویہ اپنی خاندانی حیثیت سے واقف تھا لیکن اس نے اپنی مکاری و غداری اور قوت و طاقت سے بہت کچھ کام بنا لیا۔ حضرت ابوطالبؑ جیسے دین کے محافظ اور ناصر کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ حضرت علیؑ کے باپ تھے اور حضرت علیؑ کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ حق پر تھے جب کہ معاویہ باطل پر تھا۔ معاویہ سے آپ کا اختلاف ایک بنیادی اختلاف تھا جس میں تغیر ناممکن تھا۔ یہ خیر و شر، خبیث و طیب، باطل و حق، نفاق و ایمان کی لڑائی تھی جس کا سلسلہ

کسی منزل پر نہ رک سکتا تھا۔

---

مذہب اہلبیتؑ کا پہلا بیج کشت زارِ اسلام میں شریعت کے ساتھ ساتھ سرکارِ رسالتؐ نے بویا۔ آپ ہی نے اس کی سینچائی اور نگرانی کے انتظامات کئے۔ پھر آپ کی زندگی ہی میں ایک اچھا خاصا سایہ دار درخت بن گیا۔ آپ کے بعد اہلبیتؑ کی زحمتیں اور ان کے مصائب نے اسے بارآور بنا دیا۔ آلِ رسولؐ نے اخلاص و ایمان اور ثباتِ قدم سے مخالف طوفانوں کا مقابلہ کیا اور ایک لمحہ کے لئے کسی حکومت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ تاریک دور گذرتے رہے اور شجرۂ تشیّع کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں۔ شاخیں پھیلتی رہیں یہاں تک کہ امام جعفر صادقؑ کے دور میں اس کے سایہ میں بہت سے افراد نے پناہ لے لی اور اس کے ثمرات سے ایک دنیا فائدہ اٹھانے لگی۔ آپ اموی اور عباسی سلطنت کے درمیانی وقفہ میں اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کر رہے تھے۔ لوگوں کی توجہ آپ کے مدرسہ کی طرف تھی۔ تشنگانِ علوم اور طالبانِ نورِ معرفت چار ہزار کی تعداد میں آپ کے دروازہ پر اجتماع کرتے تھے۔ ابو حنیفہ، مالک بن انس، سفیان ثوری، ابن عیینہ، اعمش جیسے ائمۂ مذاہب اور فقہاء و محدثین آپ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ تالیف کا کام تیز ہو گیا تھا۔ فقہ اہلبیتؑ کی تدوین ہونے لگی تھی اور کتابوں کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی تھی جنھیں اصول اربعمائۃ کے نام سے یاد کیا جا رہا تھا۔

---

مذہب اہلبیتؑ وہ پہلا مذہب ہے جو اموی اقتدار اور عبّاسی سلطنت کی تمام رکاوٹوں کو توڑتا ہوا تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ابن خلدون جیسے خیانت کار انسان نے اپنے مقدمہ میں اسے بدعتی مذہب قرار دیا ہے اور اس کی فقہ کو اجنبی فقہ قرار دیا ہے۔ ابن خلدون کے لئے یہ بات کوئی نئی نہ تھی اس لئے کہ اس کے دل میں عرب سے بے پناہ تعصب تھا۔ وہ اہلبیتؑ کے بارے میں دانستہ طور پر جہالت سے کام لیتا تھا۔ اس نے ان کے مذہب کو خود ان کی کتابوں سے نہیں لیا بلکہ ان کے دشمنوں سے اخذ کیا ہے اور ہر بری بات کو نظرِ استحسان سے دیکھا ہے۔ افسوس کہ بعض اربابِ قلم نے اسے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اب نہ اس کی شخصیت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رکھیں تاکہ اپنا ذاتی مفاد بآسانی حاصل ہو سکے۔ ان کے دستور میں صرف انھیں عقائد کی گنجائش تھی جو ان کے خواہشات کی تائید کر سکیں۔ اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کی سب سے بڑی مشکل خلافت کا مسئلہ تھا۔ طے یہ کرنا تھا کہ آیا امامت بھی نبوت کی طرح کوئی الٰہی منصب ہے جس کی تعیین پیغمبرؐ کے ہاتھ میں ہو۔ یا ایسا نہیں ہے؟

شیعوں کا موقف یہ تھا کہ امامت کا مرتبہ ارشاد پیغمبرؐ کے مطابق حضرت علیؑ اور ان کی گیارہ اولادِ طاہرینؑ کے علاوہ کسی کو نہیں مل سکتا ہے۔ اسی بات کو صدرِ اسلام کے مخلص اصحاب بھی کہتے رہے اور اسی بنیاد پر حکومتوں کے مصائب کا شکار بھی بنتے رہے۔

امام جعفر صادقؑ کے دور میں اس طویل وعریض علمی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب اہلبیتؑ کو ایک آفاقیت حاصل ہو گئی۔ ادھر عباسی حکومت بھی اپنے لڑکپن کی وجہ سے اتنی توانائی نہ رکھتی تھی کہ آل محمدؐ سے کھل کر مقابلہ کر سکے۔ اسے ابھی ان کی تائید اور ان کے نام کا سہارا لینے کی ضرورت تھی۔ علمی حیثیت سے سوائے امام جعفر صادقؑ کے کوئی دوسرا نمایاں فرد تھا بھی نہیں۔ امام مالک کی حیثیت مدینہ کے عوام کی سی تھی۔ ان کی شہرت کا آغاز ۱۴۸ھ سے ہوا جب امت امام صادقؑ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئی۔ ورنہ یہی امام مالک ۱۴۶ھ میں کوڑے کھا رہے تھے۔ ۱۴۸ھ امام مالک کے لئے بڑا مبارک سال ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اب منصور کی نظرِ عنایات ان کی طرف مڑ چکی تھی اور حکومت کی طرف سے یہ فرمائش ہو چکی تھی کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس پر عمل بھی کیا جائے اور جسے تمام بلادِ اسلامیہ کا مرجع بھی بنا دیا جائے۔

منصور کی اس تحریک کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ آج تک کی امامِ صادقؑ کی شہرت سے پریشان تھا۔ اور آج کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کے گرد اربابِ علم وفضل کے ازدحام اور آپ کے عالم لقب سے سرگرداں تھا۔

مالک منصور کے اس مقصد سے واقف تھے۔ اور اسی لئے انھوں نے جواب میں یہ بیان دیا کہ اس کام کی ضرورت نہیں ہے۔ اس علاقہ میں میں موجود ہوں۔ شام میں اوزاعی کام کر رہے ہیں۔ عراق والے تو عراقی ہی ٹھہرے۔ اب یہ کتاب کس کے لئے کارآمد ہو گی؟

منصور نے یہ جواب سنا تو ایک طرف اوزاعی کو مرکزِ توجہ بنایا اور دوسری طرف مالک پر مزید نظرِ عنایت مبذول کر دی۔ مالک کا دروازہ واقعی کسی مالک کا دروازہ ہو گیا۔ لوگوں کی آمد ورفت کا ایک قابلِ دید منظر تھا۔ جس کی پشت پر اپنے اصولوں کو ذہن نشین کرا کے اصولِ آلِ رسولؐ کو دماغوں سے نکالنے کی تحریک تھی۔ تھوڑے دنوں تک یہ خفیہ ریشہ دوانیاں رہیں۔ اس کے بعد جب حکومت کے دست و بازو مضبوط ہو گئے تو اس نے کھل کر آلِ محمدؐ کی مخالفت کا اعلان کر دیا۔ اور ان کے پرستاروں کے لئے اذیتوں کا راستہ کھل گیا۔

---

منصور نے یہی کام پہلے ابو حنیفہ سے لینا چاہا تھا لیکن اس کی تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی جب ابو حنیفہ نے یہ اعلان کر دیا کہ جعفرؑ بن محمدؑ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ (جامع اسانید ابی حنیفہ ا ۲۲۲)

ایک موقع پر ان سے سوال ہوا کہ ایک شخص نے اپنا مال امام کے نام وقف کیا ہے، اسے کس کو دیا جائے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ امام برحق صرف جعفرؑ بن محمدؑ ہیں۔ (تاریخ العلوئین ص۱۴۰)

زمانہ گذرتا رہا اور گذرتے ہوئے زمانہ کے ساتھ مذہب جعفری ترقی کی راہوں پر گامزن رہا منصور، مہدی، ہادی اور رشید کی ساری کوششیں رائگاں ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ رشید نے امام مالک کا سہارا لیا۔ ان کی تعظیم کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے شاگردوں کی طرح زانوئے ادب تہ کر کے بیٹھتا اور اپنے گھرانے والوں کو ان کے احترام کی تعلیم دیتا۔

ادھر شافعی کی قسمت بھی چمک گئی کہ ان کی قرشیت کا احترام ہونے لگا اور وہ مصر میں اقتدار کے قابل بنا دیئے گئے۔ قرشیت کے رشتے سے ذی القربیٰ کا حصہ بھی انھیں کو ملنے لگا منشار صرف یہ تھا کہ حضرت علیؑ کا نام خلافت کے چوتھے درجہ سے بھی ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ ابو معاویہ کا بیان ہے کہ میں ہارون رشید کے پاس حاضر ہوا تو اس نے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ علیؑ کی خلافت ثابت کرنے والوں کے ساتھ برا سلوک کروں؟ میں یہ سن کر چپ ہو گیا۔ اس نے کہا کچھ تو بولو! میں نے عرض کی اجازت ہو تو زبان کھولوں؟ اس نے اجازت دی۔ میں نے

کہا۔ اے امیر المومنین بنی تیم نے اپنے یہاں خلیفہ بنا لیا۔ بنی عدی اپنے گھرانے کی خلافت پر نازاں ہیں۔ بنی امیہ اپنے خلیفہ پر فخر کر رہے ہیں۔ اب آپ نے اگر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کا نام مٹا دیا تو بنی ہاشم میں کون سی خلافت رہ جائے گی؟ یہ سن کر رشید اپنے خیال سے باز آگیا۔ (تاریخ بغداد ۵ ۲۴۳)

رشید نے آلِ رسولؐ کے معاملہ میں اس سنگ دلی کا مظاہرہ کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی ہے۔ امام موسیٰ کاظمؑ جیسے روحانی بزرگ کو قید کر کے بے حد و انتہا سختیاں کیں اور آخر میں انھیں زہر سے شہید کرا دیا۔ جس پر امت ایک عظیم نقصان سے دوچار ہو گئی اور طالبانِ علوم کو زبردست خسارہ کا سامنا کرنا پڑا۔ امام کاظمؑ کے بعد دیگر افرادِ خاندان کی تلاش جاری ہوئی۔ حکومت کی نظر میں اپنے مقصد کے آگے حق و باطل، رحم و کرم، انسانیت و شرافت جیسے تمام الفاظ بے معنی ہو گئے تھے۔ خواہش یہ تھی کہ آلِ محمدؐ کی محبت کا وہ درخت جسے رسول اکرمؐ نے لگایا تھا اور جسے غدیر کے پانی سے سینچا گیا تھا، اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے، امت ان کے فیوض سے محروم ہو جائے۔ اور ہماری حکومت حقِ وراثت کے طور پر جائز شرعی حکومت بن جائے۔

شریک قاضی، خلیفہ مہدی کے پاس آئے تو اس نے کہا کہ تم قضاوت کے اہل نہیں ہو۔ شریک نے پوچھا کیوں؟ اس نے کہا صرف اس لئے کہ تم جماعت کے خلاف امامت کے قائل ہو۔

شریک نے عرض کی کہ جماعت کی مخالفت کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ میں نے سب کچھ انھیں سے لیا ہے اور وہی میری بنیاد ہیں۔ رہ گیا امامت کا مسئلہ تو میں اس سلسلے میں سوائے کتابِ خدا اور سنت پیغمبرؐ کے کسی اور کو نہیں پہچانتا ہوں۔ رہی قضاوت تو یہ آپ حضرات کا عطیہ ہے۔ اگر درست ہے تو باقی رکھئے ورنہ اللہ سے توبہ و استغفار کیجئے۔

مہدی نے سوال کیا، اچھا یہ بتاؤ کہ علیؑ بن ابی طالبؑ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

شریک نے عرض کی کہ جو آپ کے جد عبداللہ اور عباس کا خیال تھا۔

مہدی نے پوچھا ان کا کیا خیال تھا؛

شریک نے کہا کہ عباس مرتے مر گئے اور حضرت علیؑ کو افضل صحابہ سمجھتے رہے۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ سب علیؑ کی ڈیوڑھی پر مسائل لے کر آتے ہیں اور وہ کسی کے دروازہ پر نہیں جاتے ہیں۔ اور عبداللہ تو ان کی فوج کے ایک سپاہی اور ان کے لشکر کے ایک مجاہد ہی تھے۔ اگر ان کی خلافت غلط ہوتی تو حضرت عبداللہ ہی وہ شخص ہوتے جو اپنی علمیت کی بنا پر ان سے الگ ہو جاتے' ــــ مہدی یہ جواب سن کر اس وقت چپ رہ گیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں شریک کو معزول کر دیا۔

---

مظالم اپنا کام کرتے رہے اور مذہب جعفری اطرافِ عالم میں پھیلتا رہا۔ بغداد میں اسے اتنی طاقت حاصل ہو گئی کہ وہ کھل کر حکومت سے ٹکر لے سکے اور یہی وجہ تھی کہ دینی شعائر علی الاعلان بجا لائے جا رہے تھے۔ اور حکومت اسے اپنے وجود کے لئے ایک خطرہ محسوس کر رہی تھی۔

مامون کا دور آتے آتے طاقت کچھ اور بڑھ گئی اور اب ارکانِ حکومت، قائدینِ لشکر، صاحبانِ وزارت و ریاست بھی اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ مامون اس بات پر مجبور ہو گیا کہ خود بھی تشیع کا اظہار کرے اور علویین کی طرف خاص توجہ کرے۔ چنانچہ اسی سیاست کی بنا پر امام رضاؑ کے سامنے تختِ حکومت پیش کر دینے پر تیار ہو گیا۔ امام نے مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر اس تخت و تاج کو ٹھوکر مار دی اور آخر کار صرف نام کی ولیعہدی قبول فرمائی۔

مامون کا دربار مناظرہ کے لئے ایک اکھاڑا بن چکا تھا۔ علماء سے بحثیں ہوتی تھیں۔ امامت کے مسائل زیرِ بحث لائے جاتے تھے اور حکومت اپنی مکاری میں بڑی حد تک کامیاب ہو رہی تھی۔ شیعوں کے دل حکومت کی طرف کھنچ رہے تھے۔ صرف اس بنیاد پر کہ حکومت کا سارا افتخار امام رضاؑ کی ذات سے وابستہ ہے۔

معتصم کے دور میں شیعوں نے کسی حد تک خاموشی اختیار کی۔ لیکن اس کے بعد جب ۲۲۰ھ میں امام محمد تقیؑ کے جنازہ کو خفیہ طور پر دفن کر دینے کی سازش کی گئی اور کسی شخص کو مشایعت کی اجازت نہ ملی تو یہی شیعہ ایک عظیم سیلاب کی شکل میں ۱۲ ہزار کی تعداد میں تلواریں

لے کر نکل پڑے۔ حکومت ہزار کوششیں کرتی رہی لیکن اس کے برخلاف جنازۂ امام جوادؑ کی مشایعت انتہائی شان و شوکت اور اعزاز و احترام کے ساتھ کی گئی۔

متوکل عباسی کا دور آتے ہی مصائب دوچند ہو گئے۔ اس کے دل پر بغض علیؑ کا وہی اثر تھا جو آگ کا خشک لکڑی پر ہوتا ہے۔ اسے اس وقت تک چین نہ مل سکتا تھا جب تک صفحۂ وجود پر حضرت علیؑ کا نام رہے یا دنیا میں ان کے شیعوں کا کوئی اعزاز و احترام قائم رہے۔ اس نے علویین کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اہلبیتؑ کی توہین کو اپنا فرض قرار دیا اور ان کے ذکرِ خیر کو ناجائز بنا دیا۔ انتہا یہ ہے کہ نصر بن علی جھضمی نے پیغمبرؐ کی حدیث بیان کی کہ (جو مجھے اور حسنؑ و حسینؑ اور ان کے والدین کو دوست رکھے گا وہ قیامت کے دن میرے ساتھ میرے درجہ میں ہوگا) تو متوکل نے انھیں ایک ہزار کوڑے مارنے کا حکم دے دیا۔ جس پر جعفر بن عبدالواحد نے یہ سمجھایا کہ نصر شیعہ نہیں ہے بلکہ سنی ہے تو اس نے پانچ سو کے بعد معاف کر دیا۔ (تاریخ خطیب ۲ ۲۸۱)

مقریزی کا بیان ہے کہ امیرِ مصر یزید بن عبداللہ نے کسی سپاہی کو ایک معمولی سی تادیب کا حکم دیا اور جب اسے تادیب کی گئی اور درد کا احساس بڑھا تو اس نے امیر کو حسنین علیہم السّلام کے حق کا واسطہ دے کر معافی کی درخواست کی۔

امیر نے یہ دیکھ کر اس قسم کے بدلے میں تیس کوڑے اور بڑھا دیئے اور متوکل کو یہ اطلاع کر دی۔ متوکل نے یہ حکم بھیجا کہ اسے سو کوڑے اور لگائے جائیں اور میرے پاس بغداد بھیج دیا جائے۔ (خطیب ۴ ۱۵۳)

احمد بن محمد عاصم صاحب خان عاصم کو ایک ہزار کوڑے لگائے جانے کا حکم صرف اس لئے دیا گیا کہ ان پر شیخین کو برا بھلا کہنے کا بہتان باندھا گیا تھا۔

الحضارۃ الاسلامیہ نے منتظم سے نقل کیا ہے کہ حکومت کسی بھی شیعہ پر عتاب کرنے کا بہانہ نام علیؑ کو نہیں قرار دیتی تھی بلکہ بہترین جرم ابوبکر و عمر کو سب و شتم کرنا ہوتا تھا۔ نہ جانے کتنے ہی اس جرم میں مصائب کا شکار ہوئے اور متوکل کی جماعت نے کس کس طریقہ سے دنیا میں اپنا مقصد اور آخرت میں خدا کا عذاب حاصل کیا۔ متوکل کی دشمنی کا ایک نمونہ یہ بھی

تھا کہ اس نے ۲۳۶ھ میں امام علی نقی علیہ السّلام کو مدینہ سے سامرہ بلا کر ان پر بے حد سختیاں کیں۔ اولادِ علیؑ کے دشمنوں نے خوب خوب بہتان باندھے اور متوکل کو یہ خبر دی کہ ان کے گھر میں اسلحے اور رسالے ہیں۔ اور اسی بہانے راتوں رات آپ کے گھر پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی چیز برآمد نہ ہو سکی۔ امام ۱۸ سال تک سامرہ میں مقیم رہے اور ۲۵۴ھ میں آپ کو زہر دے دیا گیا۔

زمانہ گذرتا رہا اور شیعہ مختلف مصائب کا شکار ہوتے رہے۔ انھوں نے حکام کی طرف سے آنے والے جملہ مصائب سہے لیکن آلِ محمدؐ کی نصرت اور ان کے مذہب کی اشاعت سے باز نہ آئے۔ ان کے دل میں ایک طرف آلِ محمدؐ کی محبت کا جذبہ تھا اور دوسری طرف یہ خیال تھا کہ ان کے تحفظ کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کی وصیتیں رائگاں نہ ہونے پائیں۔ انھوں نے اہلبیتؑ کی نصرت میں اپنا سب کچھ لٹا دیا اور ان کے مدرسہ سے ہر دور اور ہر صورت میں استفادہ کرتے رہے۔ نہ ظالم کے خوف سے خانہ نشین ہوئے اور نہ حکومت کی دھمکیوں سے ان کا دامن چھوڑ سکے۔

انھوں نے حضرت علیؑ کے زمانہ سے امام عسکریؑ تک تمام احکامِ شریعت انھیں حضرات سے حاصل کئے۔ یہاں تک کہ غیبتِ صغریٰ کا پردہ حائل ہو گیا اور شیعی تحریکات ایک نئے موڑ پر آگئیں۔ متوکل نے امام عسکریؑ کو بھی آپ کے پدر بزرگوار کے ساتھ سامرہ طلب کیا تھا اور امام علی نقیؑ کے انتقال کے بعد آپ بھی ۶ سال تک عباسیوں کے مظالم کا ہدف بنے رہے اور اب امام تھے اور قید خانہ کی زندگی۔ یہاں تک کہ ۸ ربیع الاوّل ۲۶۰ھ کو ۲۸ سال کے سن میں اس امامِ برحق نے بھی دنیا کو ترک کر دیا۔ اس دور میں قم شیعیت کا ایک مرکز بن چکا تھا۔ وہاں احادیثِ اہلبیتؑ کے راوی، فقہ و حدیث کے مصنفین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ کوفہ و بغداد، مدائن و سامرہ بلکہ شام میں بھی ان کے علماء پھیلے ہوئے تھے۔

---

یہ یاد رہے کہ شیعوں کا مذہبِ اہلبیتؑ سے تمسک کرنا کسی تعصب یا فرقہ واریت کی بنا پر نہیں ہے۔ ان کا مقصد نہ کسی مذہب کی تنقید ہے اور نہ کسی امام کی توہین۔ وہ اپنے کو ان شرعی

دلائل کا پابند محسوس کرتے ہیں جنھوں نے مذہبِ اہلبیتؑ کے اختیار کرنے کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں کوئی اور بھی جائز طریقہ ہوتا تو اسی کو اختیار کر لیتے اور ان مصائب کا مقابلہ نہ کرتے۔ لیکن اسے کیا کریں کہ انھیں حق آلِ محمدؐ کے دروازہ پر ملا اور حق کا اتباع ان کے لئے ضروری تھا۔ ان لوگوں نے انھیں حضرات کو اخلاق، طرزِ ہدایت اور زہد و تقویٰ میں رسول اعظمؐ کی شبیہ پایا۔ انھیں کو قرآن کا ہمسر اور مددگار سمجھے۔ انھیں کے ذریعہ قرآن کے اسرار و حقائق دریافت کئے اور انھیں کی شان میں قرآن کو رطب اللسان پایا۔

آلِ محمدؐ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے انتھک کوشش کی۔ انھیں نیکی کا راستہ بتایا۔ ان کے درمیان علم و انصاف کی اشاعت کی ظلم و جہالت کا مقابلہ کیا۔ لوگوں نے بھی دیکھا کہ یہ حق سے ذرہ برابر بھی جدا نہیں ہیں۔ یہی اسلام کے ارکان ہیں۔ انھیں سے حق کو مرکزیت ملی ہے اور انھیں کی وجہ سے باطل نے اپنی جگہ چھوڑی ہے۔ یہ دین کو اپنے فہم و فراست سے اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کا مذہب سنا سنایا نہیں ہے۔ یہ نبوت کے اہلبیتؑ، رسالت کے محل اور وحی کا مرکز ہیں۔ ان کی مخالفت ناجائز اور ان کے غیر سے تمسک حرام ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے بار بار ان کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ حدیثِ ثقلین ان کی فضیلت کا چمکتا ہوا آفتاب ہے اور حدیثِ سفینہ ان کے ذریعۂ نجات ہونے کا پیغام ہے۔

ان کے بارے میں کچھ احادیث اور ارشاداتِ نبوی کا مختصر خاکہ یہ ہے:۔

۱۔ طبرانی نے ابن عباس سے پیغمبر اسلامؐ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص چاہتا ہے کہ میری زندگی اور میری موت اختیار کرے اور جنتِ عدن میں مقیم ہو اسے چاہئے کہ میرے بعد علیؑ کو اپنا ولی اور ان کے دوست کو اپنا دوست بنائے۔ میرے اہلبیتؑ کی اقتدا کرے۔

یہی وہ عترت ہیں جو میری طینت سے پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں کو میرا علم و فہم دیا گیا ہے، ان کی فضیلت کے منکر اور ان سے میرے رشتہ کو توڑنے والے کے لئے جہنم ہے۔ میں اس کی شفاعت نہیں کر سکتا ہوں۔ (مسند احمد بن حنبل)

۲۔ ہر دور میں امت میں میرے اہلبیتؑ کے وہ عادل افراد رہیں گے جو اس دین سے گمراہوں، باطل پرستوں اور جاہلوں کی تحریف و تاویل و افترا پردازی کو دور کرتے رہیں گے۔ یاد رکھو

کہ امام اللہ کی بارگاہ میں نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر نظر رکھو کہ تمہارا نمائندہ کون ہے۔ (صواعق محرقہ)

۳۔ نہ اہلبیتؑ سے آگے بڑھو کہ ہلاک ہو جاؤ اور نہ پیچھے رہ جاؤ کہ تباہ ہو جاؤ۔

۴۔ اہلبیتؑ کا وہ مرتبہ سمجھو جو جسم میں سر کا ہوتا ہے یا سر میں آنکھوں کا اس لئے کہ سر بغیر آنکھوں کے راستہ نہیں پا سکتا ہے۔

۵۔ جو شخص مجھ پر ایمان لایا ہے اور جس نے میری تصدیق کی ہے۔ میں اسے علیؑ کی ولایت کی وصیت کرتا ہوں۔ علیؑ کی ولایت میری ولایت ہے اور میری ولایت اللہ کی ولایت ہے۔ علیؑ کا دوست میرا دوست ہے اور میرا دوست اللہ کا دوست ہے۔ علیؑ کا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دشمن اللہ کا دشمن ہے۔

۶۔ ابن عباس نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کی جس جس آیت میں یاایھا الذین امنوا ہے علیؑ اس کے راس و رئیس اور امیر ہیں۔ (حلیۃ الاولیاء حافظ ابونعیم)

۷۔ حذیفہ کا بیان ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ سے عرض کی کہ آپ علیؑ کو خلیفہ بنا دیجئے تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم ان کو ولی مان لوگے تو وہ تم کو صحیح ہدایت کرکے صراط مستقیم پر چلائیں گے۔ (حلیۃ الاولیاء ا ۶۴) دوسری روایت میں یہ فقرہ بھی ہے کہ مگر تم ان کو خلیفہ نہ مانو گے۔

۸۔ نسائی نے خصائص ص ۲۳ پر عمران بن حصین کے واسطے سے پیغمبرؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ تم لوگ علیؑ سے کیا چاہتے ہو؟ وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ وہ میرے بعد ہر مومن کے ولی ہیں۔

۹۔ جناب ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے حضورؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔ میرا پیغام یا میں خود پہنچاؤں گا یا علیؑ"

۱۰۔ حاکم نے حضرت ابوذر کے واسطہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری معصیت کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے علیؑ کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اس کی مخالفت کی اس نے

میری مخالفت کی۔"

۱۱۔ جناب ام سلمہ نے پیغمبرؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں باہم حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے۔" (مستدرک ۳ ۱۲۴)

۱۲۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کا یہ ایمان تھا کہ اہلِ مدینہ میں سب سے بہتر قاضی حضرت علیؑ ہیں۔

۱۳۔ ابوہریرہ نے حضرت عمر سے یہ روایت کی ہے کہ علیؑ کو تین فضیلتیں ایسی مل گئی ہیں کہ اگر مجھے ایک بھی مل جاتی تو ایک عالم سے بہتر سمجھتا۔

پوچھا گیا وہ کیا ہیں؟

فرمایا "حضرت فاطمہؑ سے عقد اور رسولؐ کے ساتھ مسجد میں سکونت وغیرہ۔"

۱۴۔ حاکم نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ کی جوتیاں ٹوٹ گئیں اور حضرت علیؑ انھیں ٹانکنے لگے تو حضور اکرمؐ نے چند قدم چل کر فرمایا کہ "جیسے میں نے تنزیلِ قرآن پر جہاد کیا ہے ویسے ہی تم میں سے ایک شخص تاویلِ قرآن پر جہاد کرے گا۔

یہ سن کر حضرت ابوبکر بول اٹھے کہ کیا وہ میں ہوں؟ فرمایا نہیں۔

حضرت عمر بولے کہ حقیر ہوگا؟ آپ نے فرمایا کہ وہ میرا جوتا ٹانکنے والا ہوگا۔

یہ سن کر صحابہ نے پلٹ کر حضرت علیؑ کو اس کی بشارت دی۔ لیکن آپ نہایت اطمینان سے سر جھکائے اپنا کام کرتے رہے اور اس خبر پر کسی حیرت و تعجب کا اظہار نہ کرسکے۔

۱۵۔ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے کہ تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟ کہاں بھٹک رہے ہو؟ ہدایت کے پرچم قائم ہیں، نشانیاں واضح ہیں اور منارے نصب ہو چکے ہیں۔ اب کیوں گمراہ ہو رہے ہو تمھارے درمیان پیغمبرؐ کی وہ عترت ہے جو حق کی محافظ ہے۔ صداقت کی زبان ہے اور دین کے لئے نشانِ ہدایت ہے۔ انھیں قرآن کی جگہ سمجھو اور ان کے پاس تشنگانِ علوم کی طرح آؤ۔ پیغمبرؐ کا یہ فرمان ہے کہ ہمارا مرنے والا مردہ نہیں ہوتا ہے۔ ہمارا بوسیدہ ہو جانے والا بوسیدہ نہیں کہا جاتا ہے۔ دیکھو بغیر سمجھے ہوئے کوئی بات نہ کہو، اس لئے کہ تم اکثر حق کا انکار کرتے ہو جس پر تمھاری حجت تمام نہ ہو (یعنی میں) اسے معذور سمجھو، کیا میں نے تم میں ثقلِ

اکبر قرآن پر عمل نہیں کیا اور کیا تمھارے درمیان پرچم اسلام کو نصب نہیں کیا؟ دیکھو آلِ نبیؐ کی طرف آؤ۔ ان کا اتباع کرو۔ وہ نہ تمھیں ہدایت سے باہر نکلنے دیں گے اور نہ گمراہ ہونے دیں گے۔ وہ بیٹھیں تو بیٹھ جاؤ۔ وہ اٹھیں تو اٹھ کھڑے ہو۔ ان سے آگے نہ بڑھو کہ گمراہ ہو جاؤ اور ان سے پیچھے نہ ہٹو کہ تباہ ہو جاؤ۔

۱۶۔ حاکم نے کنانی کا یہ بیان درج کیا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوذر کو کعبہ کا دروازہ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا ہے وہ پہچان لے کہ میں ابوذر ہوں اور میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ "میرے اہلبیتؑ کی مثال سفینۂ نوح کی ہے جو اس کشتی میں سوار ہو گیا اس نے نجات پائی اور جو الگ ہٹ گیا وہ ڈوب گیا"

۱۷۔ طبرانی نے اوسط میں عمار یاسرؓ کا یہ بیان درج کیا ہے کہ حضرت علیؑ نماز نافلہ کے رکوع میں تھے۔ ایک سائل نے آپ سے سوال کیا۔ آپ نے انگشتری دے دی تو آیۂ اِنَّمَا وَلِیُّکُم نازل ہو گئی۔

یہی بیان سیوطی اور ابن مردویہ اور ابن جریر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے جس کے بہت سے ناقابل انکار شواہد موجود ہیں جیسا کہ آئندہ کسی موقع پر بیان کیا جائے گا۔

---

یہی وہ اخبار و روایات ہیں جن کی بنا پر مذہب اہلبیتؑ کا اختیار کرنا ضروری اور دیگر مذاہب کی طرف رجوع کرنا عمل کی صحت کے لئے خطرناک ہو گیا ہے۔

ہم مذاہب اربعہ کا احترام ضرور کرتے ہیں لیکن یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے کہ اس احترام کی خاطر رسول اکرمؐ کے اوامر کو نظر انداز کر دیں۔

ہمارے بری الذمہ ہونے کے لئے حدیث ثقلین، حدیث غدیر، آیت تطہیر اور آیت ولایت کافی ہے۔

ہمیں یہ دلائل اجازت دیتے اور مذہب اہلبیتؑ کو چھوڑ کر قصدِ قربت کے امکانات پیدا ہو سکتے تو ہم یقیناً دیگر مذاہب کو اختیار کر لیتے لیکن اسے کیا کریں کہ جمہور کے پاس ان کے مذہب کی ترجیح پر کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ خود ائمہ مذاہب نے اہلبیتؑ

سے استفادہ کیا ہے اور اسے باعثِ فخر سمجھا ہے۔

امام ابو حنیفہ اقوالِ امیرالمومنینؑ کو حدیث مدینۃ العلم کی روشنی میں اپنے مذہب کی ترجیح کا سبب سمجھتے تھے۔ (احسن التقاسیم مقدسی) اور امام صادقؑ کی شاگردی پر نازاں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر دو سال حضرت کی شاگردی نہ کی ہوتی تو ہلاک ہو جاتا۔

مالک بن انس امام صادقؑ کے شاگرد تھے۔

شافعی نے ان سے علم لیا اور احمد بن حنبل نے شافعی سے۔

شافعی نے حضرت علیؑ سے اس کثرت سے روایتیں لیں کہ ان پر شیعیت کی تہمت لگا دی گئی اور انھوں نے مقامِ فخر میں اس کا اعلان کیا کہ میں مذہباً شیعہ ہوں اور یہ مذہب تمام دنیا سے بلند تر ہے۔ (مناقب شافعی فخر رازی ص۱۵۱)

یحییٰ بن معین نے انھیں رافضی قرار دیتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ میں نے ان کی پوری کتاب میں سوائے حضرت علیؑ کے کسی کی روایت نہیں دیکھی ہے۔

شافعی نے اپنے اشعار میں اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ "مقام منیٰ میں حجاج کے اجتماع میں صبح سویرے یہ اعلان ہو جانا چاہئے کہ اگر آلِ محمدؐ کی محبت رافضیت ہے تو دو عالم گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔" (مناقب شافعی فخر رازی)

امام احمد حضرت علیؑ کو تمام اصحاب سے بہتر سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے افضلِ اصحابِ رسولؐ کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا حضرت ابو بکر، ان کے بعد حضرت عمر اور ان کے بعد حضرت عثمان! لوگوں نے کہا اور حضرت علیؑ! تو جواب دیا کہ تم نے اصحاب پیغمبرؐ کے بارے میں سوال کیا تھا اور علیؑ نفسِ پیغمبرؐ ہیں۔

دوسری طرف اہلِ مذاہب کے باہمی اختلافات، ایک دوسرے پر غلبہ کی کوشش، ایک دوسرے کو باطل قرار دینے کی جد و جہد وغیرہ ہے۔

مقصد یہ ہے کہ شیعوں نے مذہب اہلبیتؑ کو صرف ان آیات و روایات کی بنا پر اختیار کیا ہے جن میں ان حضرات کو نجات کا سفینہ، امّت کے لئے باعثِ امان، اللہ کی ریسمانِ ہدایت اور کتابِ خدا کا ہمسر قرار دے کر ان کے اتباع میں نجات کی ضمانت دی گئی ہے۔

ہم سابق میں ان اسباب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جن کی بنا پر حکومتوں نے بغیر کسی شرعی دلیل یا عقلی برہان کے مذہب اہلبیتؑ کو پامال کرنے کی کوشش کی اور اپنے الزامات کو ایسے مسلّمات کی شکل میں پیش کیا کہ انھیں بعد میں آنے والی نسلوں نے بغیر سوچے سمجھے اختیار کر لیا اور ان کے لئے ان سے کنارہ کشی دشوار ہو گئی۔ یہ اور بات ہے کہ ساری کوششیں مکمل طریقہ سے کامیاب نہ ہو سکیں اور مذہب اہلبیتؑ پھیلتا ہی رہا۔

یہاں پر ایک بات کا اور بتا دینا ضروری ہے کہ حکومتوں کے یہ تمام مقابلے اور ضمیر فروشوں کی یہ ساری کوششیں عقل و منطق اور حقیقت سے بالکل بیگانہ تھیں۔ انھوں نے اہلبیتؑ کا وقار گھٹانے کے لئے بے شمار تہمتیں گڑھیں اور جب جنون منزلِ آخر تک پہنچا تو شیعوں پر ائمہ معصومینؑ کی خدائی کا الزام رکھ دیا۔

اب یہ بات کہاں سے لائی گئی اور اس کی دلیل کیا ہے؟ یہ تو خدا ہی جانے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان لوگوں نے شیعوں کو بدنام کرنے کے لئے غالی فرقہ کو شیعہ کا نام دے دیا جبکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

---

# مسئلۂ غلو

شیعوں پر سب سے بڑا حملہ یہی تھا کہ انھیں غالیوں کے ساتھ ملا دیا جائے اور میری نظر میں یہ بھی حکومت کی ایک سازش تھی جس سے شیعوں کی تباہی اور اہلبیتؑ کی توہین کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

مذہب اہلبیتؑ ایک اسلامی مرکز تھا جس میں باطل کا گذر نہ تھا۔ اس لئے سیاست نے غالیوں کا سہارا لیا جس سے ایک طرف اہلبیتؑ کی توہین کی گئی اور دوسری طرف اسلام کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔

غالیوں کے پاس اسلام سے انتقام کا یہی ذریعہ تھا کہ وہ اسلام کے عقائد کو برباد کر دیں۔ اس لئے کہ اب طاقت کے مقابلہ کا امکان نہ تھا۔ وہ ذلت اٹھا چکے تھے، قید و بند کی زندگی گذار چکے تھے اور جزیہ ادا کر رہے تھے۔

اہلبیتؑ نے بروقت اپنے ان دوست نما دشمنوں کی حقیقت کو ظاہر کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ یہ غالی دین کے دشمن اور ملعون ہیں۔ شیعوں کا فرض ہے کہ ان سے دور رہیں اور بیزاری کریں۔ شیعوں نے بھی ان احکام کے زیر اثر اپنی بیزاری کا اعلان کر دیا۔ ان سے میل جول حرام، وہ نجس، انھیں زکوٰۃ دینا ناجائز، ان کے مُردوں کا غسل و کفن خلاف شرع، ان کے مسلمانوں سے ازدواجی تعلقات یا وراثت کے رشتے سب ناروا۔

امام صادقؑ نے مغیرہ بن سعید کو جھوٹا، کافر، ملعون اور ابوالخطاب جیسے لوگوں کو مستحق

لعنت قرار دے کر ان تمام بے دینوں کی مخالفت کی اور غلو جیسے قاتل مرض کو سرایت کرنے سے روک دیا۔ اب اس کا تاریخ میں نام ہی نام ہے اور بس!

امامؑ نے ایک موقع پر مرازم سے فرمایا کہ غالیوں کو یہ بتادو کہ وہ فاسق، کافر اور مشرک ہیں۔ انھیں بارگاہِ الٰہی میں توبہ کرنا چاہئے۔

کوفہ جانا تو بشار شعیری سے کہہ دینا کہ حضرت جعفرؑ بن محمدؑ نے تمھیں کافر و فاسق کہہ کر تم سے برائت کی ہے۔ مرازم کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ پہنچ کر بشار تک یہ پیغام پہنچایا تو اس نے پوچھا کہ میرے مولا نے مجھے یاد کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ اس انداز سے تمھارا ذکر کیا ہے۔ اس نے کہا، خدا تمھیں جزائے خیر دے۔

ایک مرتبہ بشار امام جعفر صادقؑ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ یہاں سے نکل جا۔ تو ملعون ہے۔ میں تیرے ساتھ ایک چھت کے نیچے جمع نہیں ہو سکتا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا تو آپ نے فرمایا کہ خدا اسے غارت کرے۔ اس نے خدا کی بھی توہین کی ہے۔ یہ شیطان بن شیطان ہے۔ میرے شیعوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ میرے شیعوں کو خبردار رہنا چاہئے۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اصلاب دار حام کی منزلوں سے گذرا ہوں۔ مجھے بھی ایک دن مرنا ہے اور میدانِ حشر میں جواب دینا ہے۔

امام حسن عسکریؑ نے اپنے ایک چاہنے والے کو یہ خط لکھا کہ میں ابن نصیر فہری اور ابن بابہ قمی سے بیزار ہوں۔ تم کو بھی ان سے بچنا چاہئے۔ میں ان دونوں پر لعنت کرتا ہوں۔ یہ ابن بابہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ میرا نبی ہے۔ خدا اس پر لعنت کرے۔ اسے شیطان نے بہکا دیا ہے۔ خدا اس کے ماننے والوں پر بھی لعنت کرے۔ یہ خبیث واجب القتل ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے ایک دن اصحاب سے فرمایا کہ خدا مغیرہ بن سعید پر لعنت کرے اور خدا اس یہودی عورت پر بھی لعنت کرے جس سے اس نے شعرو شاعری اور جادوگری سیکھی ہے۔ اس نے میرے والد پر بھی بہتان باندھا تھا۔ خدا اسے عذاب جہنم میں مبتلا کرے۔ خدا کی قسم ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اسی نے ہمیں پیدا کیا ہے اور منتخب قرار دیا ہے۔ بغیر اس کے دیئے ہوئے اختیار کے ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے رحمت و عذاب دونوں کا اختیار اسی کے ہاتھ

میں ہے۔ جو ہمارے بارے میں اس کے خلاف کہے گا وہ ملعون ہے اور جو ہمیں ہمارے خالق و مالک کی بندگی سے الگ کردے گا وہ بھی ملعون ہے۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ابو منصور بھی پکا ملعون ہے۔ وہ تو شیطان کا نمائندہ ہے۔ ہم اہلبیتؑ کے ساتھ ہر دور میں کچھ افترا پرداز رہے ہیں جو اپنے جھوٹ سے ہماری صداقت کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ جن میں مغیرہ، بزیع، سری، ابوالخطاب، معمر، بشار شعیری، حمزہ یزدی اور صائد نہدی وغیرہ ہیں۔ خدا ان سب پر لعنت کرے اور ان کے شر سے بچائے۔

حمدویہ ناقل ہیں کہ میں اس وقت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا۔ جب میسرہ نے آپ سے دریافت کیا کہ پہلے ابوالخطاب وغیرہ آپ کے پاس بہت نظر آتے تھے اور اب ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا تو آپ نے ایک مرتبہ آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ ابوالخطاب پر اللہ، ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ خدا شاہد ہے کہ وہ کافر، فاسق اور مشرک ہے۔ اس کا حشر فرعون کے ساتھ ہوگا۔

ایک دوسرے موقع پر آپ کے سامنے انھیں لوگوں کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ان سے مصافحہ کرنا، انھیں میراث دینا سب حرام ہے۔ ان میں بعض غالی تو اتنے جھوٹے ہیں کہ شیطان بھی ان کے جھوٹ کا محتاج ہے۔

ایک اور موقع پر فرمایا کہ بعض لوگ ہمیں اپنا امام کہتے ہیں۔ حالانکہ ہم ان سے بیزار ہیں۔ وہ ملعون ہیں اور ہمارے اقوال کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم صرف ان کے امام ہیں جو ہماری اطاعت کرتے ہیں۔ جو لوگ ہمیں نبی کہتے ہیں ہم ان پر لعنت کرتے ہیں اور جو اس میں شک کرتا ہے ہم اس پر بھی لعنت کرتے ہیں۔ (الشیعہ فی التاریخ)

---

غالیوں کے بارے میں انھیں ارشادات نے سیاست کے اس مشن کو فیل کر دیا اور شیعوں کے ائمہ کے بارے میں خدائی کی تہمت کا راز فاش ہوگیا۔

غالیوں کا مسلمانوں کے فرقوں میں شمار کرنا صحیح نہیں ہے اور نہ کوئی ان کے جان و مال کا ذمہ دار ہے۔ ان کے بارے میں شیعوں کا موقف معلوم کرنے کے لئے حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ

کیا جائے۔

روض الجنان شہید ثانیؒ متوفی ۹۹۶ھ ۔ نہج المقال مرزا محمد استرآبادی متوفی ۱۰۲۶ھ ۔ انتصار سید مرتضیٰ متوفی ۴۳۶ھ ۔ تہذیب شیخ طوسی متوفی ۴۶۰ھ ۔ سرائر ابن ادریس متوفی ۵۹۸ھ ۔ منتہیٰ، نہایت الاحکام، تذکرہ، قواعد، تبصرہ علامہ حلی متوفی ۷۲۶ھ ۔ دروس شہید اوّلؒ متوفی ۷۸۶ھ ۔ شرائع، معتبر، نافع محقق ابوالقاسم حلی متوفی ۶۷۶ھ ۔ جامع المقاصد شیخ علی کرکیؒ متوفی ۹۴۰ھ ۔ بحار شیخ مجلسیؒ متوفی ۱۱۱۱ھ ۔ جواہر شیخ محمد حسن نجفی متوفی ۱۲۶۶ھ وغیرہ۔

آیندہ آنے والی نسلوں سے ہماری گذارش ہے کہ وہ ان خیالات اور اتہامات پر اعتماد نہ کریں۔ بلکہ حقیقت کو اپنی تحقیق سے دریافت کریں۔ علم ہم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہا ہے اور حقانیت اپنی نصرت کی طالب ہے۔

اب آنکھوں سے تعصب کے پردے ہٹ جانے چاہئیں اور حق کو آشکار ہو کر سامنے آنا چاہیئے۔

اہلِ قلم کا فریضہ ہے کہ اس کج روی سیرت کو چھوڑ دیں۔ اپنی فکر کے خطوط کو تبدیل کریں اور شیعوں کے بارے میں تاریک دور کی داستان کو مرکزِ توجہ نہ بنائیں۔

وہ زمانہ گیا جب مذہب شیعہ کو ابن سبا کا مذہب قرار دے کر تشیّع کی توہین کی جاتی تھی۔ شیعیت کے نئے نئے معنی گڑھے جاتے تھے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ تشیع حضرت علیؑ کی دوستی کا نام ہے اور اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔

---

# عبداللہ بن سبا

وہ موہوم شخصیت جسے شجاعت وجوانمردی اور اقتدار و حکومت جیسے متعدد اوصاف سے متصف کیا گیا ہے اور جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اسی نے اہلِ مصر کو قتلِ عثمان پر ابھارا۔ حضرت ابوذر اسی کے شاگرد اور جناب عمار اسی کے پیرو تھے۔ جنگ جمل وصفین اسی کی سازشوں کا نتیجہ تھی اور مذہب شیعہ اسی کی فکری جولانی کا اثر ہے۔ جس کا تذکرہ کتابوں میں اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ گویا یہ کوئی واقعی انسان ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بعض شیعوں نے بھی اس کا ذکر کر کے اس سے برائت و بیزاری کی ہے لیکن جب ہم اس شخصیت کا پتہ لگانے کے لئے تحقیق اور تجسس سے کام لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک خیالی داستان ہے جسے باہمی تعصب اور سیاسی مکاریوں نے مذہب اہلبیتؑ کو گرانے اور اس کا وقار مٹانے کے لئے وضع کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ اصلیت۔

کاش ان داستانوں کو بیان کرنے والے تھوڑی دیر ان مآخذ پر غور کر لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ اس قصہ کا واحد ماخذ طبری متوفی ۳۱۰ھ ہے۔ اس کے علاوہ تمام مورخین نے اسی سے اخذ کیا ہے۔ طبری نے بھی اس قصہ کو سیف بن عمر سے لیا ہے جس کا سلسلۂ سند نا معلوم ہے اور خود سیف بھی علماء رجال کی نظر میں پکا جھوٹا ہے۔ مذہب شیعہ کے بارے میں "استاد کرد علی" (خطط شام ۶ ۲۵۱-۲۵۶) میں تحریر فرماتے ہیں کہ "زمانۂ پیغمبری میں بہت سے صحابہ کرام محبتِ علیؑ میں مشہور تھے جیسے سلمان جن کا قول تھا کہ ہم نے رسولؐ اللہ کی بیعت، مسلمانوں کی نصیحت اور

حضرت علیؑ کی ولایت پر کی ہے۔

یا ابوسعید خدری جن کا کہنا تھا کہ لوگوں کو پانچ چیزوں کا حکم دیا گیا ہے لیکن انھوں نے چار چیزیں نماز، زکوٰۃ، روزہ و حج تو لے لیا اور پانچویں چیز یعنی محبت اہلبیتؑ جو ایک اہم فریضہ تھی اسے ترک کر دیا۔

ابوذرؓ، عمارؓ، یاسرؓ، حذیفہ یمانی، خزیمہؓ بن ثابت، ابوایوبؓ انصاری، خالدؓ بن سعید، ابن عاصؓ، قیسؓ بن سعد بن عبادہ وغیرہ۔

بعض اہلِ قلم کا یہ خیال کہ مذہبِ شیعہ ابن سبا کی ایجاد ہے ایک وہم اور جہالت ہے۔ شیعوں میں یہ شخص قابلِ برائت اور ملعون ہے اور مذہبِ شیعہ حجاز سے ظاہر ہوا ہے۔

علامہ شیخ محمد حسین کاشف الغطا غالیوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "شیعہ ان تمام فرقوں سے بیزار ہیں۔ اگرچہ یہ فرقے نصاریٰ جیسے نہیں ہیں بلکہ یہ امام کو کسی نہ کسی اعتبار سے خدا سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ بعض صوفیوں کا بھی مسلک ہے، بلکہ حلاج گیلانی، رفاعی اور بدوی وغیرہ کے یہاں تو ایسے کلمات پائے جاتے ہیں جن سے ان کا مرتبہ خدا سے بھی بلند تر معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی شیعہ یعنی عراق و ایران کی اکثریت پاک و ہند، شام اور افغانستان کے لاکھوں مسلمان ان باتوں سے بیزار ہیں۔ انھیں کفر و ضلالت سمجھتے ہیں۔ ان کا مذہب توحید اور خالق کا مخلوق سے بلند تر ہونا ہے۔

وہ خالق میں کسی نقص، امکان، تغیر یا حدوث کے قائل نہیں ہیں۔

ان کی حکمت و کلام کی کتابیں اوصافِ باری سے بھری ہوئی ہیں اور مختصر یہ ہے کہ وہ اس قسم کے تمام الزامات سے بیزار ہیں اور انھیں اپنے اوپر ایک ظلم تصور کرتے ہیں بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ یہ بات ان کے دشمنوں کو بھی معلوم ہے لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی دوسرا حربہ نہیں ہے اس لئے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اس بات پر مجبور ہیں کہ ایسے ہی خرافات وضع کریں اور اسی قسم کی جعل سازی سے کام لیں۔ بھلا ان شیعوں پر کیا الزام لگایا جا سکتا ہے جن کے سرِ فہرست حضرت ابوذرؓ، عمار یاسرؓ، جاریہ بن قدامہؓ، جابرؓ بن عبداللہ، حذیفہؓ بن یمان، سلمان فارسیؓ، صعصعہؓ بن صوحان اور مقدادؓ کا نام ہو۔

تعجب یہ ہے کہ اکثر اہلِ قلم نے اصحابِ پیغمبرؐ کو بھی ابنِ سبا کا تابع بنا دیا ہے۔ اسلام اور رسولِ اسلامؐ پر اس سے بڑا حملہ کیا ہوگا کہ ایک یہودی آپ کے خاص اصحاب کی ذہنیتوں پر مسلط ہو کر ان کی فکر کی راہیں بدل دے۔

ابن سبا کو مذہبِ شیعہ کا بانی خیال کرنے والے ایک صاحبِ قلم کی عبارت یہ ہے:۔

"عبداللہ ابن سبا صنعاء کے یہودیوں میں وہ شیطان تھا جو نہایت چالاکی اور مکاری سے اپنی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا۔ اس نے بہت سے سادہ لوح مقدسین کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ بڑے بڑے رؤسا پر بھی ہاتھ صاف کرے۔ اس کی جماعت میں فسطاط سے غافقی بن حرب، عبدالرحمٰن بن عدیس بلوی، کنانہ بن بشر بن عتاب، عبداللہ بن زید بن ورقاء خزاعی، عمرو بن حمق خزاعی، عروہ بن نباع لیثی، قتیر سکونی۔ کوفہ سے عمرو بن الاصم زید بن صوحان، اشتر، زیاد بن نضر حارثی، عبداللہ بن الاصم، بصرہ سے حرقوص بن زہیر، حکیم بن جبلہ، ذریح بن عباد عبدی، بشر بن شریح، ابن محرش اور مدینہ سے محمد بن ابی بکر، محمد بن حذیفہ اور عمار بن یاسر تھے۔"

(حملۃ رسالۃ الاسلام، محب الدین خطیب ص۲۳)

اللہ محفوظ رکھے ایسی تہمت سے۔ اصحابِ پیغمبرؐ کو ایک شیطان کا تابع قرار دے دینا۔ کیا اس سے بڑی کوئی جسارت اور تبلیغِ پیغمبرؐ کی توہین ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شیطان نے اس مصنف پر غلبہ کر لیا تھا، اور اسی لئے اس کے قلم سے ایسے ناسزا کلمات نکل آئے۔ ہماری تمام اہلِ قلم برادری سے گذارش ہے کہ اپنی کسی تحریر میں ذاتیات اور مذہبی تعصب کو جگہ نہ دیا کریں۔ بلکہ ابن سبا جیسے قصوں کو لکھتے وقت ایک آزاد مورخ کی طرح تحقیق کریں۔ ان کا مقصد علم کی خدمت اور حق کی ترجمانی ہو۔ ان کا کام تحقیق، توضیح اور حق و باطل کی تمیز ہو۔ وہ یہ یاد رکھیں کہ ابن سبا کی داستان صرف اسلامی تعلیمات اور اس کے بزرگوں کی توہین کے لئے گڑھی گئی ہے۔ اس کی پشت پر کوئی عقل و منطق یا فکر و نظر نہیں ہے۔ اس کی سند باطل اور اس کا راوی کذاب ہے جیسا کہ آئندہ کسی باب میں ذکر کیا جائے گا۔

---

# مذہبِ جعفری کی اشاعت

یہ مذہب اپنی ذاتی صلاحیت کی بنا پر بغیر کسی حکومت و اقتدار کا سہارا لئے ہوئے سب سے پہلے سرزمینِ حجاز پر ظاہر ہوا۔

چوتھی صدی میں مدینہ منورہ میں باقاعدہ پھیل گیا۔ جو بات ابن حزم کو برداشت نہ ہو سکی اور اس نے شیعوں کی وجہ سے مدینہ منورہ کے لئے بھی ناسزا الفاظ استعمال کر دیئے۔

شام میں اس مذہب کی تبلیغ حضرت ابوذرؓ نے کی۔ چنانچہ آج بھی قریہ صرفند میں ابوذر کے نام کی مسجد موجود ہے۔ وہاں کے شیعہ حکومت کے عہدہ دار، تاجر، طبیب مرکزی حیثیت کے مالک ہیں۔ وہاں عزائے امام حسینؑ کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ اہلسنت شرکت کرتے ہیں اور خطیب کھل کر یزید و معاویہ کی سیاہ کاریوں کا اعلان کرتا ہے۔

ابن جبیر اپنے سفرنامہ میں چھٹی صدی کا حال لکھتا ہے کہ "شام میں شیعہ سنیوں سے زیادہ ہیں اور تمام شہروں پر چھائے ہوئے ہیں"۔

کرد علی کا بیان ہے کہ شام میں شیعیت پہلی صدی میں آئی اور اس کا سلسلہ جبل عامل اور بعلبک کے مہاجرین سے چاروں طرف پھیل گیا اور اب شام میں شیعوں کی تعداد دو لاکھ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

جبلِ عامل میں یہ سلسلہ حضرت ابوذر کی کوششوں سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ لبنان میں تشیع پرسکون طریقہ سے پھیل رہا ہے۔ نجف اشرف میں یہاں کی ایک جماعت

مشغولِ تحصیل ہے جس میں سے بہت سے ارباب علم مبلغین اور مجتہدین نکلتے رہے ہے۔
استاد کرد علی ہی کا کہنا ہے کہ حمص میں شیعوں کے خاص قریے ہیں بلکہ اصل شہر میں بھی مختلف جماعتیں ہیں۔
غوغہ اور نبل وغیرہ سب شیعہ ہیں۔
حلب میں بنو زہرہ کا اقتدار ہے اور یہ سب حمدانیوں کے زمانہ کے بچے ہوئے ہیں جبکہ شیخ نوح حنفی نے شیعوں کے کفر کا فتویٰ دیا تھا اور چالیس ہزار شیعوں کے قتل و غارت کے بعد ان کو شہر بدر کر دیا تھا۔
حلب میں مذہب تشیع کو اتنا اقتدار ملا کہ انھوں نے سلیمان بن عبدالجبار کو ۵۱۷ھ میں مدرسہ زجاجیہ بنانے سے روک دیا۔
افریقہ میں بھی تشیع کافی پھیلا۔ یہاں تک کہ ۴۰۷ھ میں امیر افریقہ المعز بن بادیس نے شیخین کو برا بھلا کہنے کی تہمت رکھ کر انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ قصہ یہ تھا کہ المعز شیعوں کی ایک جماعت کے پاس سے گذرا تو لوگوں نے اس سے ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا اور یہ محسوس کیا کہ امیر ان سے بیزار ہے۔ یہ دیکھنا تھا کہ سب شیعوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی اکثریت کو قتل کیا۔ ان کا اسباب غارت کیا۔ انھیں نذرِ آتش کیا۔ کچھ لوگوں نے قصرِ منصور میں پناہ لی تو وہاں بھی آب و دانہ بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شخص باہر نکلتا تھا تو ختم کر دیا جاتا تھا۔ بعض لوگوں نے مسجد میں پناہ لی لیکن وہ بھی مارے گئے۔ (تاریخ کامل ۹ ؍ ۱۲۲)
تاریخ شیعیت کے لئے یہ کوئی نیا حادثہ نہ تھا بلکہ یہاں ایسے بے شمار حادثات موجود ہیں۔
یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود افریقہ میں شیعوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ ہے۔
انڈونیشیا میں شیعوں کی تعداد تقریباً ۸۰ لاکھ ہے۔ جہاں علویین کو کافی دسترس حاصل ہے۔
انھیں میں علامہ سید محمد عقیل (صاحب نصائح کافیہ) وغیرہ تھے جن کا قیام سنگاپور میں رہتا تھا۔
مصر میں تشیع کی اشاعت ان اصحاب کرام کے ذریعہ ہوئی جنھوں نے فتح مصر میں حصہ لیا تھا۔ جیسے حضرت مقداد، ابوذر، ابورافع، ابوایوب انصاری وغیرہ۔ حضرت عمار نے تو عثمان کے دور میں اس انداز سے تبلیغ کی کہ تمام شہر حضرت علیؑ کی طرف سے حضرت عثمان کا مقابلہ کرنے کے لئے